غدر

آزادیٔ وطن کی پہلی جدّوجہد

ایک تاریخی ناول

از

رئیس احمد جعفری

بساطِ ادب
چوک انارکلی۔ لاہور
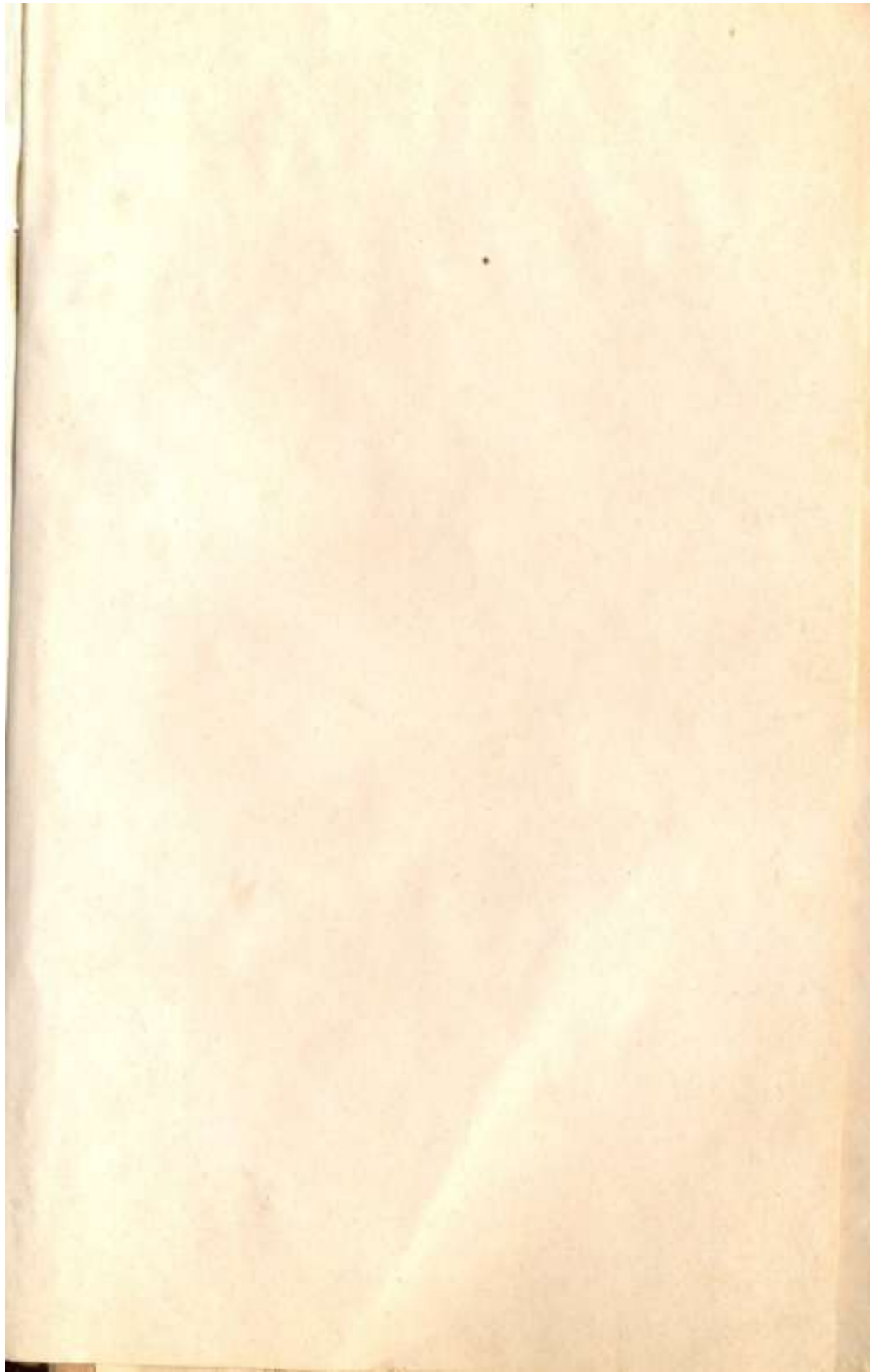
بار ... ... سوم

قیمت : ۷۵/= روپے

ناشر۔ ثنا۔اللہ بھٹہ

مطبع ۔ گنج شکر پرنٹرز لاہور

آفتاب کے نام

جس کی رفاقت نے ہر نازک

مرحلہ پر مجھے سہارا دیا!

ایک فدائی، ایک مجاہد، ایک سپاہی

بخت خاں، ایک نامور اور بہادر خاندان کا فرد تھا، افراسیاب خاں اُس کے دادا کا نام تھا، وہ خالص روہیلہ پٹھان تھا، آن پر جان قربان کر دینا، دشمن کی طاقت و شوکت سے مرعوب نہ ہونا، موت کو ایک کھیل سمجھنا، اس کی عادت تھی، خطرناک سے خطرناک موقع پڑا اس کے عزم و استقامت میں فرق نہیں آتا تھا جب لوگ فرار کی تدبیریں سوچتے تھے، وہ کمرکس کر چٹان کی طرح میدانِ جنگ میں ڈٹ جاتا تھا۔

رستم خاں، افراسیاب کے بیٹے کا نام تھا، یہ واقعی رستم تھے۔ جب تک زندہ رہے [illegible] جنہیں نہ جھکائیں، کسی کے سامنے گردن خم نہ کی مختلف رجواڑوں [illegible] اور بہادر رہے۔ جہاں رہے، عزت و آبرو، نیک نامی [illegible] فرائض انجام دیتے رہے جب کسی بات پر رُوٹھ کر [illegible] ت ہوئے تو زندگی بھر، التجاؤں اور التماسوں کے باوجود اِدھر کا رُخ نہ کیا۔

بخت خاں، انہی رستم خاں کا اکلوتا لختِ جگر تھا۔!

رستم خاں ہمیشہ جنگ کے میدانوں میں دادِ شجاعت دیتے رہے، بخت خاں کی تربیت تمام تر ماں کی رہینِ منت تھی، اس کی ماں امجدی بیگم بڑی باحوصلہ اور باہمت خاتون تھیں، انہوں نے بخت خاں کو ایک تراشا ہوا ہیرا بنا دیا۔ وہ اب

چند سطریں

یہ ایک تاریخی داستان ہے؟

ع جھلکتی ہے تیری ملّت کی آبرو اس میں!
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ اس جنگ نے مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت چھین لی، انہیں اقتدار و اختیار سے محروم کر دیا، انہیں غلام بنا دیا۔ جو قومیں زندہ رہتی ہیں وہ شکستوں اور ناکامیوں سے بھی سبق حاصل کرتی ہیں۔ یہ سبق ہمیں بھی حاصل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم زندہ ہیں۔ اور زندہ رہیں گے!

رئیس احمد جعفری
۹۸ ٹیگور پارک
لاہور

یوسف گم گشتہ!

آج امجدی بیگم بہت مصروف ہیں، اور بہت زیادہ خوش بھی، شوہر کی شہادت کے بعد آج ان کے لبِ تبسم سے آشنا ہوئے ہیں، بڑے چاؤ سے گھر کے انتظام میں لگی ہیں، در و دیوار صاف ہو رہے ہیں، باورچی خانہ دُرست ہو رہا ہے، خود اپنے ہاتھ سے کئی قسم کے کھانے پکا رہی ہیں، آج ان کے دیور دلا(ور خاں) دلّی سے آئے ہیں۔ دلاور خاں، رستم خاں کے چھوٹے بھائی ہیں، (ا)یک عرصہ سے دلّی میں مقیم ہیں، خفا ہو کر گھر سے نکل گئے تھے، دلّی پہنچے، کچھ دنوں وہاں کے کوچہ و بازار میں آوارہ گردی کرتے رہے، پھر کمپنی بہادر (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے نوکر اور نمک خوار بن گئے، انگریزوں کی طرف سے ایک ریزیڈنٹ دلّی میں رہتا تھا، جو کلکتہ کی ہدایات کے مطابق لال قلعہ کی رہنمائی کرتا رہتا تھا، دلاور خاں اسی ریزیڈنٹ کے دفتر میں ملازم تھے، فارسی اچھی خاصی جانتے تھے۔ شُد بُد انگریزی بھی سیکھ لی تھی، پہلے محرّر (کلرک) ہوئے، پھر رفتہ رفتہ ذاتی مددگار (پرسنل اسسٹنٹ) بن گئے، جب بھرتی ہوئے تھے تنخواہ پانچ روپے تھی۔ اب ترقی کرتے کرتے ڈیڑھ سو تک پہنچ گئے تھے، اس زمانہ میں برکت ایسی تھی کہ بڑے سے بڑے قحط میں بھی گیہوں روپیہ کا دس سیر اور گھی روپیہ سیر ملتا تھا، یہ ڈیڑھ سو ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھے، بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے، گھر میں کئی نوکر چاکر زنان خانہ میں کئی مامائیں تھیں۔

بائیس سال کا کڑیل تھا! زندگی عمل کی دعوت دے رہی تھی، ذمہ داریاں اپنی طرف بلا رہی تھیں اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا، !

جب تک رستم خاں زندہ رہے، اس نے بڑے آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کی جو مانگا وہ پایا، جو چاہا وہ ہوا جس کی تمنّا کی اسے حاصل کر لیا۔ امجدی بیگم کی زندگی کا مقصود و مطلوب اس کے سوا کون تھا؟ لیکن اب خود امجدی بیگم یہ چاہتی تھیں کہ وہ گھر سے باہر نکلے، کچھ کر کے دکھائے، اپنے دادا اور بےخوف باپ کا نام روشن کرے، اور کچھ کمائے بھی !
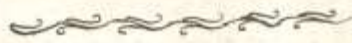
ہوگی، وہ اسے بہت چاہتے تھے، دن بھر اپنی عادت کے خلاف گود میں لئے لئے گھومتے تھے، اس کا پائجامہ پیشاب اپنے صاف ستھرے کپڑوں پر بڑی خوشی سے کراتے تھے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی بڑی نعمت مل گئی، گھر سے بھاگ کر دلی پہنچنے کے بعد بخت خاں کی یاد اکثر خون کے آنسو رولایا کرتی جب وہ یاد آجاتا تو آنسو ضبط کرنا مشکل ہوجاتا، چھپ چھپ کر روتے لیکن دل نہ سنبھلتا۔

زخمی دل کے لئے زمانہ سے اچھا مرہم کوئی نہیں، تھوڑے دنوں کے بعد وہ نئی فضا، نئے ماحول، اور نئے شہر سے مانوس ہوگئے، ایک شریف و نجیب خاندان کی ایک سلیقہ مند اور خوش اندام و خوش شکل لڑکی سے شادی کرلی، کچھ عرصہ بعد بھائی، بھاوج، اور بھتیجے کی محبّت، اس نئے کنبہ میں تحلیل ہوگئی، لیکن بھائی کے حادثۂ شہادت نے پرانے زخم ہرے کردیئے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے، کیا یاد آیا،

مظلوم اور محبوب بھائی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی، بیوہ اور بے کس بھاوج کی یاد ستانے لگی، نوجوان اور تقریباً اَن دیکھے بھتیجے کا شوق دید بیقرار کرنے لگا، راستہ بھر یوں تو انہیں اور بھی کئی باتیں یاد آئیں لیکن بخت خاں بار بار یاد آتا۔ وہ سوچتے تھے جب میں گیا تھا تو وہ ننھا سا بچہ تھا، نہ بات کرسکتا تھا، نہ چل پھر سکتا تھا، پھر بھی مجھے کتنا پیارا لگتا تھا، اور اب تو ماشاءاللہ وہ جوان ہوگیا ہے، مجھ بھیّا باپ کی تصویر ہوگا۔

یہی سوچتے، اور انہی فکروں میں غوطے کھاتے بریلی پہنچ گئے۔

وہ مکان جس میں انہوں نے بچپن گذارا تھا جب نظر کے سامنے آیا، تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا، زمانہ کتنا آگے نکل گیا، لیکن یہ جُوں کا توں کھڑا ہے، نہ جیسے

اودھ اور بریلی میں کیسے کیسے انقلابات آئے لیکن دلاور علی خاں دلّی سے باہر نہ نکل سکے، کچھ گھر سے بھاگ آنے کی شرم، کچھ ملازمت کی مصروفیتیں کچھ بڑے بھائی کی خفگی کا ڈر۔ ہر بار ارادہ کر کر کے رہ جاتے، عین وقت پر کوئی نہ کوئی مانع پیش آجاتا۔ اور اپنا عزم سفر ملتوی کر دینے پر مجبور ہو جاتے لیکن بھائی کی خبر شہادت سُن کر ضبط نہ کر سکے، بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر روئے، جب ذرا دل ہلکا ہُوا، تو صاحب سے اجازت مانگی، کچھ حالات و مسائل ایسے درپیش تھے کہ اجازت ملنے میں برابر تاخیر ہوتی رہی۔ آخر پُورے چار ماہ کے بعد اجازت ملی، وہ بھی صرف ایک مفتہ کی، تن تنہا دلّی سے نکلے اور بریلی پہنچ گئے۔

امجدی بیگم، دلاور علی خاں کو دیکھ کر اپنا غم بھُول گئیں، انہوں نے دلاور کو بچوّں کی طرح پالا تھا، بہت دنوں تک اولاد سے محروم رہیں اور دلاور ہی کو اولاد سمجھتی رہیں، رستم علی خاں بھی چھوٹے بھائی کو اولاد سے کم نہیں سمجھتے تھے، ہر خواہش اور ہر ضد پُوری کرتے تھے لیکن تربیت اور آداب کے معاملہ میں ڈانٹ ڈپٹ اور سختی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، ایک مرتبہ ایسی ہی کسی بات پر روٹھ کر بھاگ گئے پھر مدّتوں پتہ نہ چلا بیچاری امجدی بیگم نے رو رو کر جل تھل کر دیا، ایک عرصہ کے بعد دلاور کا معافی نامہ آیا جس میں اپنی خطاؤں پر پشیمانی کا اظہار کیا گیا تھا، اور ملازم ہو جانے کی خوش خبری دی گئی تھی، امجدی بیگم کی باچھیں نورِ مسرّت کھل گئیں، ان کا یوسف گم گشتہ مل گیا، فوراً دلّی جانے کو تیار ہو گئیں، رستم علی خاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"وہ انگریزوں کا ملازم ہے، ہم اس کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے، تم جاتی ہو تو جاؤ، لیکن ہماری مرضی نہیں ہے!"

دلاور علی خاں جب گھر سے بھاگے تھے تو بخت خاں کی عمر مشکل سے ایک سال

بہتی جا رہی تھیں۔
دلاور علی خاں بڑھ کر، بھاوج کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے، اور بھرائی
آواز میں کہا۔
"بھابی ——"
اور پھر ان کی آواز ساتھ نہ دے سکی، وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگے، امجدی بیگم یونہی بے حس و حرکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں کہ ایک دفعہ
تیورا کر گریں اور بیہوش ہو گئیں!

ہٹتا ہے۔ نہ آگے بڑھتا ہے۔ نہ جنبش نہ حرکت، جس حالت اور جس وضع قطع میں اسے چھوڑا تھا آج بیس سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی ہئیت اور صورت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

کاش انسانی زندگی بھی ایسی ہوتی۔ —— انقلاب وتغیر سے ناآشنا!

دلاور علی خاں کو ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی ایک نوجوان نظر آیا، بالکل رستم علی خاں کی تصویر، اسے دیکھ کر ٹھٹکے، اور پوچھا:۔

دلاور علی خاں: کیا تمہارا نام بخت خاں ہے۔

بخت خاں: جی ہاں میرا نام یہی ہے، لیکن میں آپ کو پہچان نہ سکا، کس سے ملنا چاہتے ہیں آپ؟

دلاور علی خاں (بھرآئی ہوئی آواز میں) تم سے، تمہاری ماں سے —— میرا نام دلاور علی خاں ہے!

یہ کہتے ہی انہوں نے اسے سینہ سے لگا لیا، دونوں آنکھیں پرنم ہوگئیں، بخت خاں نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"چچا جان آپ نے تو ہمیں بالکل فراموش کر دیا!"

دلاور علی خاں نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا "بیٹے، میں تمہیں کبھی نہیں بھولا، تمہیں میں نے گودوں میں کھلایا ہے، تمہاری ننھی سی تصویر ہمیشہ میری آنکھوں میں پھرتی رہی!"

باتیں کرتے کرتے دونوں گھر کے اندر پہنچ گئے، امجدی بیگم، دلاور علی خاں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں، اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں، نہ خوشی کا اظہار کر سکیں، نہ غم کا، نہ مسکرا سکیں، نہ اپنے چہیتے دیور کے استقبال کے لئے اُٹھیں۔ [illegible] کی پذیرائی کی، وہ ایک عجیب از خود رفتگی کی سی کیفیت سے انہیں دیکھے

ارادے سے بھی زیادہ۔

امجدی بیگم:۔ مانتی ہوں بھیّا لیکن ایک شرط میری ماننی پڑے گی وعدہ کرو تعمیل کرو گے!،،

دلاور خاں۔ بھابی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں، بھلا آج تک میں نے آپ کی نافرمانی کی ہے؟ کبھی ایسا ہُوا ہے کہ آپ نے کوئی حکم دیا ہو اور میں نے اس کی تعمیل نہ کی ہو؟ آپ کی شرط ضرور پُوری ہوگی، فرمایئے!

امجدی بیگم:۔ وہ شرط یہ ہے کہ بخت سے چاہے نوکری ڈھلوا لینا، لیکن انگریزوں کی سرکار میں وہ نوکری نہیں کرے گا، یہ بات نہ مانی تو نہ زندگی بھر تمہاری صورت دیکھوں گی نہ بخت سے کبھی میرا دل صاف ہوگا، بلکہ عاق کر دوں گی اسے!

دلاور علی خاں:۔ (ہنسکر) بھابی آپ انگریزوں سے بہت خفا معلوم ہوتی ہیں آخر انہوں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟

امجدی بیگم:۔ بگاڑا ہو یا نہ بگاڑا لیکن میری یہ بات تمہیں ماننی پڑے گی،!

دلاور علی خاں۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیکن بھابی اپنی ضد سے بخت کا مستقبل تو نہ برباد کریں۔

امجدی بیگم:۔ اگر بخت کے مستقبل کا انحصار انگریزوں کی ملازمت پر ہے، تو بڑی خوشی سے میں اس کا تباہ و برباد ہونا منظور کروں گی، مجھے یہ منظور ہے، بخت فاقے کرے اور مزوری کرے، لیکن یہ نہیں گوارا کر سکتی کہ وہ انگریزوں کی نوکری کر کے عیش عشرت کی زندگی بسر کرے۔

اب وہ بخت خاں سے کہہ رہی تھیں!

بیٹے تم بھی میری یہ نصیحت یاد رکھنا، یہ میری نصیحت ہے، اور تمہارے شہید باپ کی وصیّت!

باپ کی وصیّت

ایک ہفتہ چشم زدن میں گزر گیا، دلاور علی خاں کے جانے کا وقت بھی آگیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ امجدی بیگم کو ساتھ لینے جائیں، لیکن وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئیں انہوں نے کہا۔

"اس گھر سے میری لاش ہی نکل سکتی ہے، یہاں ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ زندہ ہیں، اور حسب معمول سفر پر گئے ہیں، آجائیں گے کچھ عرصہ بعد، یہاں سے باہر نکلی تو آس کا یہ دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، اس گھر میں ہوں تو زندگی کے معمول میں کوئی اجنبیّت نہیں محسوس ہوتی، باہر جاؤں گی تو یہ بات ختم ہو جائے گی۔

جب امجدی بیگم کسی طرح رضامند نہ ہوئیں تو دلاور علی خاں نے اصرار کیا بخت جواں کو ساتھ کر دیں۔ نوجوان لڑکا ہے، یہاں رہ کر بے راہ ہو جائے گا، وہاں کچھ عرصہ بعد روزگار کی کوئی معقول صورت نکل آئے گی، کماؤ پوت بن جائے گا، جتنے قرضے ہیں۔ وہ ادا کر دے گا۔ گھر بس جائے گا۔ آدمی بنے گا۔" یہ بات امجدی بیگم کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بخت خاں کو بھیجنے پر رضامند ہو گئیں، لیکن ایک شرط سے۔

"بھیا تم بخت کو ساتھ لے جانا چاہتے ہو، شوق سے لے جاؤ، میں منع کرنے والی کون؟ تمہارا بچہ ہے،!"

دلاور خاں :- بے شک میں اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، حتیٰ کہ

سفر

دلّی اور بریلی میں کچھ بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے، ڈاک کی سواری پہ تیسرے دن دو آدمیوں کا مختصر سا قافلہ دلّی پہنچ گیا۔

بخت خاں جب بریلی سے روانہ ہوا تو اس کا دل گوناگوں جذبات سے معمور تھا۔ اس کی جدائی، دوستوں کا فراق، وطن سے دُوری، یہ خیالات تھے جو اس کے دل و دماغ پر فکر اور پریشانی کی صُورت میں چھائے ہوئے تھے۔ آج تک اس نے بریلی سے قدم باہر نہیں نکالا تھا، ہر نیا کام شروع کرتے ہوئے، خواہ وہ کیسا ہی امید افزا ہو، ایک قسم کی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے، بخت خاں دلّی جانے پر خوشی خوشی رضامند ہو گیا تھا لیکن جب وقت رخصت آیا۔ تو اس کی خوشی غم سے بدل گئی، جن چیزوں کو وہ بہت معمولی سمجھتا تھا، جنہیں وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا وہی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں، اب معلوم ہُوا، ان کی بھی چاہت دل میں موجود تھی لیکن تحت الشعور میں دبی ہوئی تھی۔

راستہ میں بخت خاں کو مناظر کی دلکشی نے بار بار اپنی طرف متوجہ کیا، دلاور علی خاں نے بھی دل دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، نتیجہ یہ ہُوا کہ دلّی کی سرزمین پر جب اس نے قدم رکھا۔ تو دل اشتیاق اور تجسّس کے جذبے سے معمور تھا۔

دلّی کیا ہے؟ دلّی والے کیسے ہیں؟ یہاں کے آداب کیا ہیں؟ رسوم کیسے ہیں۔

یہ کہتے کہتے امجدی بیگم کی آواز بھرّا گئی۔ اوران کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

دلاور علی خاں :- بھابی یہ آپ نے کیا کہا؟ کیا بھائی صاحب کی یہ وصیّت ہے؟

امجدی بیگم :- ہاں بھیا، وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے، اور میں نہیں چاہتی کہ بجنت کوئی ایسی بات کرے جس سے ان کی روح کو صدمہ ہو، !

دلاور علی خاں :- میں بھی نہیں چاہ سکتا، اطمینان رکھیئے، اگر بخت نے خود بھی کبھی انگریزوں کی نوکری کرنی چاہی، تو جب تک میں زندہ ہوں ایسا نہیں ہوگا!

امجدی بیگم :- (مسکرا کر) اب آگئے تم اپنی اوقات پر! ——— خیر، اب منزل کھوٹی نہ کرو، جاؤ سدھارو، دیر ہو رہی ہے خدا تمہارا نگہبان ہو۔

⁂⁂⁂

بخت خاں۔ بہن؟ — کوئی ہماری بہن بھی ہے؟ چچاجان نے بالکل ذکر نہیں کیا۔

قدسیہ بیگم۔ اونہہ، ان کی نہ کہو، انہیں خود اپنا ہوش نہیں ہے کسی کو یاد کیا رکھیں گے؟ اے لو، بڑی عمر آ گئی میری بچی — آ، ذبیحی، دیکھو یہ ہیں بخت میاں جن کے قصے تمہارے ابا ہمیشہ سنایا کرتے تھے، — ٹھٹھک کیوں گئی لڑکی؟ ادھر آ، سلام کر!

ایک خوبصورت، سراپا نور دوشیزہ اپنی شرمگیں آنکھوں کو جھکائے آگے بڑھی، ہاتھ اُٹھا کر ماتھے پر رکھا، اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

قدسیہ بیگم کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی، خفا ہو گئیں۔

اے واہ ری لڑکی، کچھ ناٹک کر رہی ہے کوئی غیر سمجھا ہے اسے؟ بخت ہی تو ہے، بیٹھتی کیوں نہیں کھڑی کیوں ہے؟

وہ دامنی طرف، ہمت کے پاس بیٹھ گئی — لیکن خاموش، یہ خاموشی بھی قدسیہ بیگم کو پسند نہ آئی۔

"اے میں کہتی ہوں جمیلہ آج تجھے ہو کیا گیا ہے؟ چُپ کیوں ہے؟"

اب جمیلہ سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ گردن جھکائے جھکائے بے ساختہ جواب دیا۔

"کچھ میں ہی تو چُپ نہیں ہوں آپ کے سوا سب ہی چُپ بیٹھے ہیں،"!

جمیلہ نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی تھی لیکن ایک لطیفہ بن گئی، بڑے زور کا قہقہہ لگایا بخت، دلیر اور ہمت نے، قدسیہ بیگم بچاری کچھ جھینپ سی گئیں اس لئے کہ یہ فقرہ ان کے سراپا پر چھا گیا تھا۔

بخت خاں۔ تو یہ ہیں جمیلہ، لیکن آپ نے ان کا تعارف تو کرایا نہیں۔

قدسیہ بیگم۔ وہ خود ہی اپنا تعارف کرا چکی ہیں، میں کیا کہوں —؟

یہ سب معلوم کرنے اور دیکھنے کے لئے اس کی طبیعت مچل رہی تھی، بریلی سے وہ جتنا افسردہ اور غمزدہ روانہ ہوا تھا، دلّی میں اتنا ہی شگفتہ اور مسرور داخل ہوا۔

گھر میں اس کی پذیرائی بہت اچھی طرح ہوئی، قدسیہ بیگم —— دلاور علی خاں کی بیوی —— بہت محبّت اور شفقت کے ساتھ پیش آئیں، دلاور علی کے بیٹے ہمّت علی اور دلبر علی بھی بہت اخلاق اور اپنایت کے ساتھ ملے، بخت خاں ان سب کے اخلاق، تپاک اور محبّت و شفقت سے بہت متاثر ہوا۔ ذرا بھی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی، یہ معلوم ہوا، جیسے گھر میں باپ اور ماں کی شفقت سے لطف اندوز اور بھائیوں کی بے تکلفی، اور اپنایت سے خوش ہو رہا ہے۔

دلاور علی خاں تو بیوی سے بھتیجے کا تعارف کر کے "صاحب" کے دربار میں چلے گئے، قدسیہ بیگم نے امجدی بیگم کی خیریت دریافت کی، ان کے حالات پوچھے، پھر اپنے بیٹوں کا تعارف کرانے لگیں، ہمّت علی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں۔

اسے سیدھا نہ سمجھنا بڑا نٹ کھٹ ہے۔ اس وقت بھیگی بلّی بنا بیٹھا ہے بخت خاں ہنسنے لگا، اور گویا ہوا۔

"چچی جان ہم تو انہیں سیدھا ہی سمجھیں گے۔ ہمارے ساتھ تو کوئی شرارت کی نہیں انہوں نے!"

قدسیہ بیگم۔ تو بیٹے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ اب تو خدا چاہے رہو گے، دیکھ لینا کیسا شیطان ہے یہ!

بخت خاں۔ پھر قائل ہو جاؤں گا —— اور ہاں یہ دلبر میاں کیسے ہیں؟ ان کی بھی تو بات کریں۔

قدسیہ بیگم۔ یہ ٹھیک ہے، محنت سے پڑھتا ہے۔ باپ سے ڈرتا ہے، ماں کا ادب کرتا ہے، بہن کا خیال رکھتا ہے ——

ہمت علی۔ (زور سے ہنسکر) نہیں مجھے کچھ بے وقوف سمجھ رکھا ہے تم نے؟
سخت خاں۔ ارے بھئی کچھ ہماری خبر بھی تو لو، وہ کون سی بات ہے جس کا تم
دونوں ابھی چرچا کر رہے تھے۔؟
ہمت علی۔ نہیں کچھ نہیں۔
سخت خاں۔ کیوں جمیلہ تم بھی نہ بتاؤگی؟
جمیلہ۔ میں تو نہیں بتا سکتی، لیکن اگر آپ اصرار کرتے ہیں، تو پھر ہمت کو اجازت
دیتی ہوں، وہ کہہ دے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔
ہمت علی۔ کیوں باجی بتادوں!
جمیلہ۔ کہہ تو دیا ایک دفعہ، کیا بار بار کہلوا رہے ہو؟
ہمت علی۔ ابا کہتے تھے۔ آپ ان کے کپڑوں پر پیشاب کردیا کرتے تھے؟
سخت خاں کو ہنسی آگئی، اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور کہا،
"بڑے شریر ہو تم لوگ!"
جمیلہ بول پڑی "اسے کہئے ہمت کو ہی ہے، ویسے بڑا بگلا بھگت بنا
رہتا ہے۔"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ قدسیہ بیگم آگئیں، پسینہ میں شرابور شاید چولھے کے
پاس سے آرہی تھیں، آئیں، اور آتے ہی برس پڑیں۔
"تم لوگوں نے تو دماغ چاٹ لیا ہوگا لڑکے کا۔"
ہمت علی خاموش نہ رہ سکا۔
لڑکے؟ ــــــ بھائی جان کو آپ لڑکا کہہ رہی ہیں؟"
قدسیہ بیگم نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔
لڑکا نہ کہوں تو کیا مرد کہوں؟ میرے بیٹے تو لڑکا ہی ہے،!

بخت خاں کو پھر ہنسی آ گئی۔

بخت خاں۔ جمیلہ تم کچھ پڑھتی بھی ہو؟

قدسیہ بیگم۔ (جانے کے لئے اُٹھتے ہوئے) پڑھنے کے سوا ان کا شغل ہی کیا ہے،؟

بخت خاں۔ یہ تو بڑی اچھی عادت ہے بہن۔

جمیلہ۔ آج پہلی مرتبہ میں نے آپ سے اس عادت کی اچھائی سُنی ہے، ورنہ اماں جان تو ہمیشہ طعنے ہی دیا کرتی ہیں۔

بخت خاں۔ ایہ تو زیادتی ہے، میں کہوں گا چچی جان سے پڑھنے لکھنے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے، ا ــــ چچا تو کچھ نہیں کہتے؟

جمیلہ۔ نہیں، وہ تو میرا ساتھ دیتے ہیں۔

بخت خاں۔ ساتھ دیتے ہیں؟ یعنی کیا پڑھائی کے سوال پر گھر میں فرقہ بندی ہو جاتی ہے کوئی ایک طرف ہے کوئی دوسری طرف؟

جمیلہ۔ (مسکرا کر) جی ا ــــ ایسا ہی ہوتا ہے ہمارے ہاں تو۔

بخت خاں۔ ہاں جمیلہ ایک بات تو بتاؤ کیا چچا جان ہمارا ذکر کیا کرتے تھے؟

جمیلہ۔ ہاں بہت زیادہ۔

بخت خاں۔ ہمارے بارے میں کس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے؟

جمیلہ۔ بہت دلچسپ قسم کی۔

بخت خاں۔ مثلاً ــــ کچھ تو کہو۔

جمیلہ۔ وہ کہنے والی باتیں نہیں ہیں۔

ہمت علی۔ کہو باجی۔ وہ اس روز والی بات۔

جمیلہ۔ ہاں ــــ کہنے نہ بیٹھ جانا۔

دِلّی!

یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

شاہجہان اور عالمگیر کی دِلّی اب بدل چکی ہے۔ سُورج اب بھی اسی طرح جگمگاتا ہے۔ چاند اب بھی اس طرح چمکتا ہے۔ ستاروں کی محفل آسمان کے فرش پر اب بھی اسی طرح آراستہ ہوتی ہے، جیسے پہلے ہوتی تھی، لیکن اب وہ رونق، وہ چہل پہل وہ گہما گہمی کہاں! میر نے شاید اپنے دل، نہیں، دلّی کے بارے میں کہا اور ٹھیک کہا تھا ؎

یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا ——!

واقعی اس شہر پر کئی مرتبہ آفتیں آئیں، کئی بار طوفان آئے، ہلاکتوں اور بربادیوں کے بگولے اُٹھے۔ خونیں آندھیاں چلیں۔! —— لیکن گذر بھی گئیں!

یہیں اسی شہر میں چنگیز اور ہلاکو کے جانشین، مغل اور تاتار تلواریں سونت سونت کر نمودار ہوئے، یہ وہ لوگ تھے۔ جو انسانی سروں کے بلند مینار تعمیر کرتے تھے، لیکن علاؤالدین خلجی نے انہیں نوک دم بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا پھر بہت دنوں بعد یہیں، اسی شہر میں نادرشاہ درّانی کی تلوار آبدار چمکی، اور دِلّی کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہوگئی، لیکن یہ طوفان کی طرح آیا، اور آندھی کی طرح گذر گیا، خون ریزی کشت و

ہمت علی۔ بس تو پھر شامت آئی ابا جان کے صاف ستھرے کپڑوں کی!
قدسیہ بیگم۔ کچھ دیوانہ ہوا ہے۔ ابا جان کے صاف ستھرے کپڑے کیوں یاد آ گئے اس وقت؟

جمیلہ مسکرانے لگی۔

"ہے ایک بات، لیکن آپ سے کہنے کی نہیں ہے۔"

بخت خاں۔ ان باتوں سے بہت خفیف ہوا، لیکن قدسیہ بیگم آڑے آگئیں، انہوں نے کہا۔

"چل بیٹے، کھانا تیار ہے، دو لقمے کھالے۔"

پھر وہ جمیلہ سے مخاطب ہوئیں۔

"جاؤ بیٹی دسترخوان بچھاؤ، کھانا نکالو۔"

ہمت علی کھسک گیا، جمیلہ کھانا نکالنے اور دسترخوان بچھانے چل گئی۔ اور بخت خاں قدسیہ بیگم کے پیچھے پیچھے کان دبائے، کھانے کے کمرہ کی طرف چل دیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، واقعی چچا کی اولاد، بڑی شوخ اور شریر ہے۔!

دوسرے کو ختم کرکے اس کے راج پاٹ کا مالک بن جانا چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا، اس کو شہ دی، اسے اکسایا، اس کی مدد کی، اس سے لڑے، کسی کو دوست بن کر دھوکا دیا۔ کسی کی دشمن بن کر جان لی، ایک ایک کرکے بہت سی ریاستیں اپنی تحویل میں لے لیں، بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا؛ ہر ریاست جو دوسری ریاست سے لڑنا چاہتی تھی، انگریزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مدد کے لئے دیکھتی رہتی تھی، انگریز مدد کرتے تھے، اور اس مدد کی قیمت وصول کرتے تھے، ان کی فوجیں تربیت یافتہ تھیں، جدید فنونِ جنگ سے واقف تھیں نئے نئے ہتھیاروں سے مسلح تھیں حبِّ وطن کے جذبہ سے سرشار تھیں، اپنے ملک کو، اپنی قوم کو سربلند دیکھنے کے لئے، ہر قربانی، ہر ایثار پر آمادہ تھیں، یہ فوجیں ہر بڑی اور مضبوط ریاست کے خلاف ہر چھوٹی اور کمزور ریاست کی طرف سے، مورچہ بندی کرکے جنگ آزما ہوتی تھیں، جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد ہاری ہوئی ریاست کی ہر چیز پر قبضہ کرلیتی تھیں، اور جیتی ہوئی راست کو اپنا باجگذار بنا لیتی تھیں، یہاں تک کہ بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کی شکست نے انگریزوں کے لئے میدان ہموار کردیا، اب تک دلی کی مرکزی حکومت ان کی دست بُرد سے بچی ہوئی تھی، لیکن نا بہ کے[1] شاہ عالم نے صورتِ حال کا اندازہ کرکے ۱۸۰۶ء[2] میں دیوانی کے اختیارات لارڈ کلایو کو سونپ دیئے، دلی پہنچنے کے بعد، انگریزوں کے حوصلے اور بلند ہوگئے، اب وہ سارے ہندوستان پر بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے، اب کوئی ابدالی نہیں تھا جو آتا اور بچاتا، اب کوئی بابر نہیں تھا، جو لڑتا اور کامیاب ہوتا، اب کوئی اورنگ زیب نہیں تھا جو تلوار کا جواب تلوار سے دیتا، شاہ عالم کے بعد حکومت اکبر شاہ ثانی کے ہاتھ میں آئی یہ شاہ عالم سے بھی زیادہ کمزور تھے، ان کے دور میں

---

[1] تاریخ ہند (ذکاء اللہ) [2] ۱۸۰۶ء۔

خون اور مار دھاڑ کی مدت چند دن سے زیادہ نہ تھی، یہاں، اسی شہر پر، مرہٹوں کی دل بادل فوجوں نے یلغار کی۔ وہ ارادہ کرکے آئے تھے کہ لال قلعہ پر قبضہ کرلیں گے، انہوں نے عارضی قبضہ کر بھی لیا۔ لال قلعہ کی نقرئی اور طلائی چھت اُتار ڈالی، مزارات کی طلائی جالیاں اُکھاڑلیں، دِلّی کو اور دِلّی والوں کو خوب لُوٹا، وہ سوچ رہے تھے مغل ایمپائر کا خاتمہ کرکے مرہٹہ ایمپائر کی بنیاد ڈالیں گے۔ جامع مسجد کو ڈھاویں گے اور مسلمانوں کو غلام بنالیں گے، وہ تنہا نہ تھے، ان کے ساتھ، گائیکواڑ کی فوجیں تھیں، سندھیا کا لشکر تھا، بلکہ کی سپاہ تھی، بھونسلہ کے سورما تھے، بھرت پور کا جاٹ راجہ سورج مل تھا، اور ہندوستان کے تمام ہندو والیان ریاست تھے، ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ مسلمانوں کا چراغ اقتدار ٹمٹماتے ٹمٹماتے گل ہو جائے گا مغل حکومت ختم ہو جائیگی اور مسلمان حاکم سے محکوم بن جائیں گے، لیکن یکایک وہ مردِ مجاہد احمد شاہ ابدالی — نمودار ہوا جس کی شمشیر خاراشگاف بجلی کی طرح چمکی اور جس نے مرہٹوں نے خرمن حیات کو خاکستر کرکے رکھ دیا، اور پھر برسوں مرہٹوں کے گھروں سے نوحۂ و ماتم کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، صرف مرہٹہ ایمپائر کا خواب ناکام نہیں ہوا مرہٹہ قوم تباہ ہوگئی، اور مسلمان پھر جاہ جلال اور شان و شکوہ کے ساتھ دادِ شہر یاری دینے لگے۔ غلام قادر روہیلہ کی سفاکیوں اور خون آشامیوں کا بھی اس شہر نے نظارہ کیا، لیکن اس خونیں غسل کے بعد وہ اور زیادہ نکھر گیا، اس کی آب و تاب کچھ اور بڑھ گئی، اس کی گہما گہمی اور رونق اس طرح واپس آگئی، گویا ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔

لیکن اب دِلّی پر انگریز قابض تھے، یہ اس دیس میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، رفتہ رفتہ حکمرانی اور شہر یاری کا جذبہ اُبھرا دِلّی کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی، راجواڑوں اور ریاستوں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا، سازشوں و ریشہ دوانیوں اور باہمی مخالفتوں کی گرم بازاری تھی، ہر ایک، دوسرے کو ہضم کر لینا چاہتا تھا، ہر ایک

قِسمت کے کھیل

اب گورنر جنرل کے منصب پر لارڈ کیننگ فائز ہیں، جو کام ویلزلی اور ڈلہوزی سے نہ ہو سکا۔ اس کی تکمیل کا بیڑہ، اس نئے گورنر جنرل نے اُٹھایا، اور فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کی عظمت وجلال کے نقشِ آخر "لال قلعہ" کے دروازہ پر تالا لگا دیا جائے، بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا جائے، اور سارے ہندوستان پر انگریزی پرچم لہرایا جائے۔

کلکتہ کے گورنر جنرل ہاؤس میں، لارڈ کیننگ، کمپنی بہادر کے مختارِ مطلق کی حیثیت سے، ایک شاندار، اور مرصع کمرہ میں رونق افروز ہیں، ماتھے پر شکنیں پڑی ہیں، آنکھوں کی سُرخی، قہر وجلال کی نشان دہی کر رہی ہے، چہرے کا اضطراب بتا رہا ہے، کوئی خاص مسئلہ ہے، جس پر غور فرمایا جا رہا ہے، کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں، کبھی کسی کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتے ہیں، کبھی دروازے کی طرف گھورنے لگتے ہیں، جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں، اس اثنا میں ایڈی کانگ آیا، لاٹ صاحب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس نے دست بستہ عرض کیا۔

مسٹر ہاروے دِلّی کے ریزیڈنٹ شرفِ باریابی حاصل کرنا چاہتے ہیں!"

لاٹ صاحب نے چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ فرمایا ـــــ "آنے دو"

تھوڑی دیر میں مسٹر ہاروے تشریف لائے، لارڈ کیننگ نے کچھ پرتپاک استقبال

انگریزوں نے طے کر لیا کہ، اس بادشاہت کا ڈھونگ ختم کر دینا چاہیئے، چنانچہ سر چارلس مٹکاف نے لارڈ ولزلی کو اپنے مراسلہ میں تحریر کیا: "بادشاہ کی تعظیم اس طرح نہ کرنی چاہیئے، جس سے بادشاہی قوت کا احساس بیدار ہو، اگر ہم نہیں چاہتے کہ اسکی حکومت دوبارہ قائم ہو تو ہمیں چاہیئے، بادشاہی کا خیال اس کے ذہن سے نکال دیں لیکن یہ خیال خیال کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا، کیونکہ انگریز عجلت پسند نہ تھے وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے، ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے، ان کا دل حکومت کے ولولے سے خالی تھا۔ باپ کی بے چارگی اور بے بسی نے انہیں دنیا، اہل دنیا اور جاہِ دنیا سے متنفر اور بیزار کر دیا تھا۔ بڑے اچھے شاعر تھے، اور شعر کہہ کہہ کر دل بہلایا کرتے تھے۔ تصوّف سے بھی دلچسپی تھی، شاعری سے فرصت ملتی تو وظائف میں مشغول ہو جاتے، اس سے وقت بچتا تو شاعری کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خدا کی یاد، یا معرفتِ نفس، نہ کوئی حوصلہ، نہ امنگ، ولولہ، نہ ارادہ مشیّتِ الٰہی پہ قانع، راضی بہ رضائے الٰہی، !

لارڈ کیننگ۔ کس طرح؟ کیونکر؟ صرف الفاظ سے کام نہیں چل سکتا۔ ہم حقائق (یعنی FACT) چاہتے ہیں۔

مسٹر ہاروے۔ یورا کسی لینسی میں وہی پیش کر رہا تھا عید بقرعید کے موقع پر بادشاہ کی خدمت میں جو نذریں گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے ریزیڈنٹ حاضر دربار ہو کر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ پیش کیا کرتا تھا وہ سلسلہ لارڈ ایلنبرمی نے بند کر دیا تھا، چنانچہ اب ایسا نہیں ہوتا، میں نے ریذیڈنسی میں جب سے قدم رکھا ہے ایک اور بُری رسم بھی ختم کر دی ہے! اب تک یہ معمول تھا کہ ریزیڈنٹ، بادشاہ کو، جب کوئی تحریر بھیجتا، تو اپنے کو بادشاہ کا "فرزند ارجمند" لکھا کرتا تھا۔

لارڈ کیننگ۔ ہاں ہمیں معلوم ہے، سر چارلس مٹکاف کے زمانہ میں اسی دستور پر عمل ہوا کرتا تھا۔

مسٹر ہاروے۔ لیکن میں نے یہ رسم بند کر دی۔[1]

لارڈ کیننگ۔ بہت اچھا کیا۔ (مسکرا کر) ـــــ مگر آپ کے اس اقدام پر بوڑھے اور بے بس، بادشاہ نے کوئی احتجاج تو نہیں کیا؟

مسٹر ہاروے۔ بادشاہ خود تو اپنی ذات سے واقعی مرد درویش ہے، میرا خیال ہے، اسے اب نہ بادشاہی کی ہوس ہے، نہ تخت و تاج کی آرزو، وہ اپنی ساری زندگی اللہ اللہ کر کے بسر کر دینا چاہتا ہے، لیکن اس کے مصاحب اور ندیم، بڑے ذات شریف ہیں، وہ اسے بار بار یاد دلاتے ہیں، کہ تم بابر کی اولاد ہو، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کی نسل سے جلیل القدر بادشاہ ہو، اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی یادگار ہو، یہ بادشاہت

---

[1] تاریخ ہند (ذکا اللہ)

نہیں کیا۔ رسمی طور پر ہاتھ ملایا، اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، ہاروے صاحب بدستور کھڑے رہے کچھ دیر کے بعد لاٹ صاحب نے فرمایا ـــــ "بیٹھ جائیے" اور وہ بیٹھ گئے۔!

ہاروے صاحب خود بھی انگریز تھے، اور وہ جانتے تھے کہ ایک انگریز حاکم دوسرے انگریز حاکم سے کس طرح کا برتاؤ کرتا ہے۔ انہیں آج تک اپنے کسی دوسرے گورنر جنرل سے یہ شکایت نہیں ہوتی تھی۔ لارڈ کیننگ سے وہ کئی مرتبہ مل چکے تھے لیکن آج پہلی مرتبہ لاٹ صاحب بگڑے بگڑے، اینٹھے اینٹھے نظر آرہے تھے۔ آخر کیوں ؟

لارڈ کیننگ کچھ دیر تک ہاروے کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتے رہے، پھر انہوں نے بلند آواز سے سوال کیا۔

لارڈ کیننگ۔ کہئے مسٹر ہاروے، دِلّی کا کیا حال ہے ؟

مسٹر ہاروے۔ دِلّی کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں، عوام بے فکری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بادشاہ کو احساس ہوگیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا، لہٰذا راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ گیا ہے۔

لارڈ کیننگ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہادر شاہ کی خدمت میں عیدین کے موقع پر کمانڈر انچیف اور گورنر جنرل کی طرف سے نذریں پیش کی جاتی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو قطعاً ناقابلِ برداشت ہے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی ستم ظریفی ہوسکتی ہے، کہ جو ہمارا وظیفہ خوار ہو، اس کے سامنے ہم سر جھکائیں، اس کی خدمت میں نذریں پیش کریں ؟

مسٹر ہاروے۔ یور اکسی لینسی، دِلّی کی بادشاہت ختم کرنے کے سلسلہ میں ہمارا جو پروگرام ہے، اس پر آہستہ آہستہ لیکن نہایت سختی سے عمل ہو رہا ہے ۔

نے احتجاج کیا!

مسٹر ہاروے۔ احتجاج نہیں، التماس، میں نے جو تحریر اس کے پاس بھیجی، اس کا لب ولہجہ بالکل بدلا ہوا تھا، نہ خود کو بادشاہ کا ۔فرزندارجمند، لکھا نہ بادشاہ کو حضور فیض گنجور، لکھا۔ بادشاہ کے وزیر حکیم احسن اللہ خاں نے یاد دہانی کرائی کہ اب تک ایسا نہیں ہوا تھا آپ نئی بات کیوں کرتے ہیں! ہر ریزیڈنٹ اپنے آپ کو بادشاہ کا فرزندِ ارجمند لکھتا تھا، میں نے کہا جناب میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں، پھر بادشاہ یا کسی اور کا فرزندارجمند کیسے بن سکتا ہوں؟ میں اپنا نسب بدلنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

لارڈ کیننگ۔ (بے انتہا خوش ہو کر) شاباش، شاباش، بہت خوب، تمہاری ذہانت اور حاضر جوابی نے ہمیں کافی متاثر کر لیا ہے!

مسٹر ہاروے۔ نوازش ہے یور اکسی لینسی کی!

لارڈ کیننگ۔ ہمارے پاس بہادر شاہ کے مطالبے آ چکے ہیں!

مسٹر ہاروے۔ مجھے معلوم ہے یور اکسی لینسی!

لارڈ کیننگ۔ اور تم نے ہر مطالبہ کی تائید کی ہے، ہماری خفگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے، بادشاہ چاہتا ہے کہ اس کے وظیفہ میں اضافہ کر دیا جائے، ـــــ کیا ایک لاکھ ماہوار نا کافی رقم ہے؟ جبکہ اس کی ذاتی جائیداد اور جاگیر بھی ڈیڑھ لاکھ روپے ماہوار سے زیادہ ہے؟ ـــــ ہمیں حیرت اور غصّہ اس پر ہے۔ کہ تم نے اس مطالبہ کی تائید کی!

مسٹر ہاروے۔ یور اکسی لینسی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے تائید نہیں کی، میں تو چاہتا ہوں، جلد از جلد یہ قیصہ جو لگا رہ گیا ہے کٹ جائے، آخر ہم بہادر شاہ کو بادشاہ کیوں مانیں؟ جبکہ اختیار و اقتدار کے مالک ہم ہیں، لیکن یور اکسی لینسی میں نہایت

ے بالکل مستند اور درو شمار ہو!

تمہاری تھی، یہ ملک تمہارا ساتھ دے گا، اور یہ مٹھی بھر انگریز یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔!

لارڈ ڈلہنینگ۔ (تیور کے ساتھ) انگریز، کبھی نہیں ہارتا، کبھی نہیں بھاگتا۔!

مسٹر ہاروے۔ بے شک، اور آنے والا وقت بتا دے گا کہ انگریز نہ ہارتا ہے، نہ بھاگتا ہے، نہ اپنے عزائم سے دستبردار ہوتا ہے، وہ دنیا میں حکمرانی کے لئے پیدا ہوا ہے، وہ جہاں پہنچتا ہے، فیروزمندی اور خوش اقبالی اس کے ساتھ جاتی ہے، بیشک ہم مٹھی بھر تھے، مٹھی بھر ہیں، اور شاید مٹھی بھر رہیں گے، لیکن ہم نے فرانسیسیوں کا زور ختم کر دیا، ہم نے مرہٹوں کو کچل ڈالا، ہم نے اودھ جیسے زبردست اور طاقتور ملک کا الحاق کر لیا، اور واجد علی شاہ کو جلا وطن کر دیا، ہم نے بنگال کی اسلامی حکومت اور اسلامی طاقت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، ہم نے صوبہ بہار پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا، ہم نے ٹیپو سلطان ہی کو ختم نہیں کیا، بلکہ سارے دکن پر تسلط قائم کر لیا، اب مدراس ہمارا ہے، بمبئی ہمارا ہے، میسور ہمارا ہے، حیدرآباد ہمارا ہے، کرناٹک ہمارا ہے، کس میں ہمت ہے کہ ہم سے سرتابی کرے؟ کس میں جرأت ہے کہ ہمیں چیلنج کرے! پنجاب کے سکھوں نے سر اُٹھایا تھا لیکن ہم نے انہیں پیس کر رکھ دیا، رنجیت سنگھ کی حکومت اب ہماری تحویل میں ہے ہندوستان کے بڑے بڑے رجواڑے، جن کے راجہ اور مہاراجہ اپنی عظمت و شوکت پر فخر کیا کرتے تھے، اب اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم ان کے سرپرست اور مربّی ہیں۔!

لارڈ ڈکینگ۔ مسٹر ہاروے میں آپ سے بہت خفا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو برطرف کر دوں گا۔ اگرچہ میرے شبہات اب تک قائم ہیں، اور ان کا میں ابھی ذکر بھی کروں گا لیکن پہلے اپنی داستان ختم کر لیجئے، بار بار تو بہادر شاہ

مطالبہ پر غور کریں گے،!

مسٹر ہاروے۔ یور اکسی لینسی، یہ بڑی معقول تجویز ہے اس طرح ہمارا بھرم بھی قائم رہ جاتا ہے، اور ہم بدعہدی کے مرتکب بھی نہیں ٹھہرتے ——
لیکن اگر بہادر شاہ نے ہماری پیش کش منظور نہ کی تو؟

لارڈ کیننگ۔ تو ہم ان کی درخواست مسترد کر دیں گے —— کیا تم بھی مخالفت کرو گے؟

مسٹر ہاروے۔ نہیں، بالکل نہیں،!

لارڈ کیننگ۔ بادشاہ دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ چونکہ ولی عہد سلطنت مرزا فخرو کا انتقال ہو چکا ہے، لہذا شہزادہ جوان بخت کو ولی عہد تسلیم کر لیا جائے، کیا وہ بادشاہ کی اولاد میں سب سے بڑا ہے،

مسٹر ہاروے۔ جی نہیں، چھوٹا ہے،!

لارڈ کیننگ۔ پھر ہم اس مہمل مطالبہ کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟ ہمیں اس پر بھی غصہ تھا کہ تم اتنے زیرک ہو کر ایسی مہمل باتوں کی تائید کرتے ہو؟ یہ ماننے والا مطالبہ ہے؟

مسٹر ہاروے۔ عالی جاہ میں نے بادشاہ کی اس استدعا پر اعتراض کیا تھا لیکن انہوں نے دو باتیں ایسی کہیں کہ مجبوراً ان کی تائید اور سفارش کرنی پڑی! بادشاہ نے مجھے یاد دلایا کہ کمپنی بہادر ان سے وعدہ کر چکی ہے کہ ولی عہد وہی ہوگا، جسے بادشاہ منتخب کریگا خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور دوسرے وزرا انہوں نے بلا کر، ایک محضر میرے سامنے پیش کر دیا جس پر جوان بخت کے تمام بھائیوں کی مہریں تھیں اور دستخط تھے، اور ان سب نے یہ اعتراف کیا تھا کہ ذہانت، قابلیت اور انتظام مملکت میں مہارت کے اعتبار سے جوان بخت ہم سب پر

ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ جب تک بادشاہ کو معزول نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک ہمیں اپنے وعدوں کی پابندی کرنی چاہیئے!

لارڈ کیننگ۔ وعدے! ـــــ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

مسٹر ہاروے۔ لارڈ آکلینڈ نہیں ہیں لارڈ کیننگ، گورنر جنرل تھے، وعدہ کیا تھا کہ وظیفہ کی رقم بڑھا دیں گے،

لارڈ کیننگ۔ اب لارڈ آکلینڈ نہیں، ہیں لارڈ کیننگ، گورنر جنرل ہوں، اب اکبر شاہ ثانی نہیں، بہادر شاہ بادشاہ ہے!

مسٹر ہاروے۔ یور ایکسی لینسی، اس سے کچھ نہیں ہوتا ـــــ لارڈ آکلینڈ نے گورنر جنرل کی حیثیت سے وعدہ کیا تھا، اور اکبر شاہ سے یہ وعدہ اس لئے کیا تھا کہ وہ بادشاہ ہند تھے، اب صورت حال یہ ہے کہ بادشاہ وقت، گورنر جنرل سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے، اور میری قومی حمیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ہم وعدہ شکن کہلائیں!

لارڈ کیننگ۔ (ہنس کر) تم ابھی نوجوان ہو، تم نے شاید تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، تم اپنے ملک اور اپنی قوم کی تاریخ سے بھی واقف نہیں معلوم ہوتے ـــــ اچھا ہم تمہاری سفارش مانے لیتے ہیں، بہادر شاہ کے وظیفہ میں حسب دلخواہ اضافہ کریں گے، لیکن ایک شرط سے، شرط یہ ہوگی کہ بہادر شاہ وظیفہ کی رقم بڑھوا کر اپنے تمام گذشتہ موجودہ اور آئندہ حقوق و مطالبات سے دستبردار ہو جائیں، انہیں لال قلعہ کے بجائے مونگیر میں رہنا ہوگا، وہ[1] دلی میں بھی نہیں رہ سکتے، اگر وہ یہ منظور کر لیں تو ہم ہمدردی سے ان کے

---

(۱) یہ دستاویزی (ڈاکومنٹری) چیزیں خاص تاریخی مسلسند کی حامل ہیں، میں نے انہیں مکالمات کی شکل دے دی ہے۔

ہمارے اس فیصلہ کی اطلاع دے دی جائے! اور ولی عہد کی تنخواہ، بادشاہ کی تنخواہ میں سے منہا کر کے دی جاتی ہے، اس اثنا میں وہ تنخواہ کس کو ملتی رہی؟

مسٹر ہاروے۔ کسی کو نہیں، سوا پانچ ہزار روپے کے قریب ہر مہینہ وضع کر کے بطور امانت اپنے پاس رکھ لیتا ہوں[1]۔ بادشاہ نے کئی بار احتجاج بھی کیا لیکن میں نے یہی جواب دیا کہ جب تک ولی عہدی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا یہ رقم میرے پاس محفوظ رہے گی۔

لارڈ لینڈنگ۔ بہت ٹھیک ——— اب یہ ساری رقم مرزا قویاش کو دے دی جائے!

مسٹر ہاروے۔ بہت بہتر!

لارڈ کینینگ۔ مرزا قویاش کو ولی عہدی کی اطلاع دینے سے پہلے انہیں بتا دیا جائے کہ شرط یہ ہے کہ بادشاہ کی وفات کے بعد انہیں لال قلعہ کی سکونت ترک کر دینی ہوگی۔ نیز ایک لاکھ ماہوار کے بجائے، پندرہ ہزار ماہوار وظیفے کی صورت میں ملیں گے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ نہیں کہلائیں گے، صرف "پرنس" اُن کا لقب ہوگا!

مسٹر ہاروے۔ بہت بہتر ——— یہ شرائط مجھے باقاعدہ طور پر مل جائیں تو دِلّی پہنچتے ہی مرزا قویاش سے معاملہ طے کر لوں گا!

لارڈ کینینگ۔ کیا تم تحریر چاہتے ہو؟ نہیں اس سلسلہ میں کوئی تحریر نہیں دی جائے گی۔

مسٹر ہاروے۔ بہت خوب، عالی جاہ، میں سب سمجھ گیا ہوں۔

لارڈ کینینگ۔ آپ دِلّی کب جائیں گے؟

---

[1] سر ٹامس مٹکاف کی ڈائری سے یہ تاریخی حقیقت ہے۔

فائق ہے۔ لہٰذا ہم اس کو ولی عہد تسلیم کرتے ہیں، اور اس کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں ——— آپ ہی غور فرمایئے اس کے بعد میرے لئے اس کے سوا کیا چارۂ کار تھا کہ اپنی تائید اور سفارش کے ساتھ یہ مطالبہ آپ کی خدمت میں بھیج دیتا۔

لارڈ کیننگ۔ (جیب سے ایک کاغذ نکال کر) کیا تم مرزا قویاش کو جانتے ہو؟

مسٹر ہاروے۔ عالی جاہ ——— بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بہادر شاہ کا لڑکا ہے۔ اور غالباً ——— سب سے بڑا ہے،!

لارڈ کیننگ۔ (کاغذ اٹھاتے ہوئے) یہ مرزا قویاش کی درخواست ہے، اس نے لکھا ہے کہ ولی عہدی میرا حق ہے، کیونکہ سب بھائیوں سے بڑا میں ہوں۔ بادشاہ نے میرے دستخط لالچ دے کر [illegible] تنخواہ بڑھا دیں گے، لیکن میں اپنے دستخط واپس لیتا ہوں، اور ہز اکسی لینسی گورنر جنرل کے ذریعہ کمپنی بہادر سے عرض گذار ہوں کہ جواں بخت کے بجائے میری ولی عہدی تسلیم کی جائے،!

مسٹر ہاروے۔ تعجب ہے، سخت تعجب ہے۔

لارڈ کیننگ۔ کیوں تعجب کی اور وہ بھی اتنے سخت تعجب کی کیا بات ہے!

مسٹر ہاروے۔ مرزا قویاش سے میں نے پوچھا تھا کہ تم نے دستخط کسی دباؤ سے کئے تھے یا اپنی مرضی سے؟ اس نے جواب دیا اپنی مرضی سے، وہ اس قدر جلد بدل کیسے گیا؟

لارڈ کیننگ۔ حیرت اور تعجب کی کوئی ضرورت نہیں ہمیں بہرحال اپنے اصول اور ضابطہ کے تحت فیصلہ کرنا ہے ——— ہم مرزا قویاش کی ولی عہدی تسلیم کرتے ہیں۔ جواں بخت کو ولی عہد نہیں مان سکتے، (تحکمانہ لہجہ میں) بادشاہ کو

مسٹر ہاروے۔ آج ہی چلا جاؤں گا، میں تو صرف حسب الحکم حاضر ہوا تھا ——
مجھے امید ہے کہ اب یور اکسی لینسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔!
لارڈ کیننگ۔ نہیں، اب ہم تم سے خوش ہیں ہم نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ ہماری
پالیسی اچھی طرح سمجھ لو، پالیسی کے بارے میں تحریر اور خط و کتابت اتنی مفید
نہیں ہوتی جتنی آمنے سامنے بیٹھ کر بحث گفتگو۔!

مسٹر ہاروے نے لارڈ کیننگ کو مطمئن کر دیا کہ وہ نئی پالیسی پر صدق دل
سے اور دیانت کے ساتھ عمل کریں گے۔ ان کی وفاداری گورنر جنرل اور گورنر
جنرل کے توسط سے کمپنی بہادر کے لئے وقف ہے، بادشاہ کی اگر کبھی کبھی کسی مسئلہ میں
تائید کر بھی دیتے ہیں، تو صرف اس لئے کہ حقیقی معنی میں کمپنی بہادر کے مفاد کا تقاضا
یہی ہوتا ہے، ہندوستان ہر انگریز کا مقصد صرف یہ ہے کہ انگلستان کا پرچم بلند ہو،
اور اس سرزمین کے ایک ایک چپہ پر اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ لارڈ کیننگ
نے مسٹر ہاروے کی اس یقین دہانی پر خوشنودی کا اظہار کیا، اور پرتپاک مصافحہ کر کے
رخصت کر دیا، دونوں کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔!
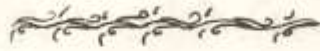
جمیلہ

جمیلہ جتنی خوبصورت تھی، اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت بھی، گھر کے کاموں کا سارا بوجھ تن تنہا اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی، قدسیہ بیگم اتنی کاہل تھیں کہ ان کے لئے اٹھ کے پانی پینا بھی مشکل تھا، کبھی کبھار کوئی مہمان آگیا، یا کوئی تقریب ہوئی تو تھوڑی دیر کے لئے باورچی خانہ کی طرف جھانک لیا، ورنہ سارا کام کاج جمیلہ ہی کرتی تھی، باپ کی خدمت، ماں کی چاکری، بھائیوں کی دیکھ بھال اور اب نئے مہمان بخت خاں ــــ کی خاطر داشت، سب کچھ اس کے ذمہ تھا وہ بڑی خندہ جبینی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔ پھر پڑھنے لکھنے بیٹھ جاتی۔ اُردو تو اس کی مادری زبان تھی، فارسی بھی اچھی خاصی لکھ پڑھ لیتی تھی، پڑھنے لکھنے سے فراغت ہوتی تو سینے پرونے بیٹھ جاتی۔ اس فن میں بھی کام کرتے کرتے وہ اتنی مشاق ہوگئی تھی کہ نازک سے نازک کام اتنی خوبی اور ستھرائی سے انجام دیتی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

شروع میں تو بخت خاں کو، جمیلہ سے ویسی ہی دلچسپی تھی، جیسی ایک عزیز کو ایک سے ہو سکتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ دلچسپی بڑھنے لگی، وہ اب قلعہ میں بادشاہی ملازم ہوگیا تھا، شہسواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی، جملہ فنون سپہ گری میں وہ ماہر تھا، چند ہی ماہ بعد، بادشاہ کے سواروں میں نوکر ہوگیا، کام کم تھا، تنخواہ معقول تھی۔

بخت خاں آیا، اور اس کی مدارت گذاری کے لئے پہنچی، پانی گرم کرکے دے رہی ہے کہ ناشتہ تیار کر رہی ہے۔ دسترخوان بچھا رہی ہے، اس کی پسند کی چیزیں بڑے ذوق شوق سے پکا رہی ہے اور اصرار کرکر کے کھلا رہی ہے، وہ کن انکھیوں سے یہ سب باتیں دیکھتی تھیں، لیکن خاموش رہتی تھیں، بدقسمتی سے یا متی بھی اسی کو زیادہ تھیں، نہ رنجیدہ دیکھ سکتی تھیں نہ پریشان، اسی لئے اس کے خلافِ مزاج کوئی بات کرتے ہوئے ہچکچاتی تھیں عجب کشمکش و پیچ کے عالم میں گرفتار تھیں، ایک طرف بہن کا پاس، دوسری طرف لڑکی کا لحاظ، وہ یہ بھی دیکھتی تھیں۔ تراب علی جب آجاتا ہے۔ تو جمیلہ پروا بھی نہیں کرتی کون آیا اور کون گیا، لیکن بخت خاں کے آنے کا وقت ہوا، اور وہ سراپا انتظار نظر آنے لگی بخت خاں کے نوکری پر جانے کا وقت آیا اور وہ سراپا سنعدی کا پیکر بن گئی۔ یہ باتیں کسی کی نظر سے بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔

آخر بڑے غور و خوض کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ خود بھی لڑکی کا رجحان دیکھنا چاہیئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کریں گی وہی جو جمیلہ کی مرضی ہو گی، ایک روز دوپہر کے وقت انہوں نے جمیلہ کو اپنے پاس بلایا، وہ آئی تو بڑے محبّت بھرے لہجہ میں کہا۔

"بیٹی میرے سر میں درد ہو رہا ہے، ذرا دبا دے۔"

قدسیہ بیگم جس چارپائی پر لیٹی تھیں، وہیں سرہانے جمیلہ بیٹھ گئی۔ قدسیہ کی نظر سامنے دیوار پر تھی، اور جمیلہ کی نظریں کے سر پر، دیوار کے اگلے حصّہ پہ آئینہ بندی کی ہوئی تھی جس سے جمیلہ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بآسانی نظر آسکتا تھا۔ اصل میں قدسیہ بیگم کا منشا یہ تھا کہ نظر چار کئے بغیر اس سے کام کی باتیں کریں۔ جمیلہ خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ سر دبانے لگی، دفعتہً اس کے کانوں میں ماں کی محبّت بھری اور شیریں آواز گونجی۔

اس نے اپنے مرحوم باپ کی وصیت اور بوڑھی ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنے چچا دلاور علی خاں کی طرح انگریزوں کی نوکری نہیں کی وہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا، انہیں غاصب، ظالم اور خونی ڈاکو جانتا تھا۔ دلاور علی خاں کی تاکید یہ بھی کہ قلعہ اور گھر کے علاوہ کسی تیسری جگہ بے اجازت نہ جانا۔ اور اس نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا، یوں تو گھر میں وہ چچی قدسیہ بیگم کے پاس بھی بیٹھتا، چچا دلاور علی سے باتیں کرتا، دلیر علی اور ہمت علی سے بھی کہانیاں کہتا اور داستانیں سنتا، لیکن سب سے زیادہ توجہ جمیلہ پر کرتا۔ پڑھنے لکھنے میں اسے مدد دیتا، اس کی مشکلیں حل کرتا، معلومات میں اضافہ کے لئے اسے کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتا، قدسیہ بیگم اس التفات فراواں سے کبھی کبھی گھبرا بھی جاتیں، لیکن خاموش رہتیں، وہ یہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ بخت جمیلہ سے محبت کرتا ہے، اور یہ کوئی بُری بات بھی نہ تھی۔ عام حالات میں وہ بڑی خوشی سے بخت کے ساتھ جمیلہ کو بیاہ دیتیں، اس لئے کہ اس سے اچھا داماد مشکل ہی سے ملتا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے بھانجے تراب علی سے اس کی نسبت شوہر کے علم واطلاع کے بغیر چپکے چپکے پختہ کر چکی تھیں، انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا کہ جب چاہیں گی اس رشتہ دلاور علی خاں سے منظور کرالیں گی، اس لئے کہ انہوں نے آج تک بیوی کی کوئی بات رد نہیں کی تھی۔

لیکن جب سے بخت آیا تھا، ان کی یہ خود اعتمادی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی تھی وہ محسوس کر رہی تھیں، اگر بخت خاں اور تراب علی خاں کے درمیان انتخاب کا سوال اُٹھا، تو وہ بے تامل تراب علی کو نظر انداز کر دیں گے، اور بخت خاں کو منظور کرلیں گے یہ ایسی بے سان وگمان مصیبت پیش آگئی تھی کہ اس کا کوئی تدارک سمجھ میں آتا ہی نہیں تھا، سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ جمیلہ کا رجحان بھی بخت خاں کی طرف دیکھ رہی تھیں، آخر جہاں دیدہ عورت تھیں۔ جمیلہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہو۔ لیکن

مجھے بہت مانتے ہیں جس کی سفارش کر دیتا ہوں مان لیتے ہیں، اور نہ جانے کیا کیا بے پَر کی اڑایا کرتے ہیں، !

قدسیہ بیگم ۔ ہاں یہ بات تو اس کی مجھے بھی بہت بُری لگتی ہے، ایک دفعہ تو میں نے ٹوک بھی دیا تھا، بیٹے ہمارے سامنے کیوں بنتے ہو، آخر تمہیں جمیلہ کے باپ ہی نے نوکر رکھایا ہے ہم سب جانتے ہیں۔ کون کتنے پانی میں ہے ؟ اس وقت تو خاموش ہو گیا، چار پانچ دن بعد آیا، تو پھر ویسی ہی باتیں کرنے لگا۔

جمیلہ ۔ میں نے بھی ایک دفعہ ٹوکا تھا۔ مگر ان پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

قدسیہ بیگم ۔ بخت ایسی باتیں نہیں کرتا، !

جمیلہ ۔ بالکل نہیں۔ ہم سب اتنے ہیں ان کی تنخواہ ساٹھ روپے ہے، تو اب میاں سے بیس روپے زائد لیکن بڑائی کا کیا ذکر، وہ جوتا ٹوپی بھی آپ سے یا ابّا جان سے پوچھے بغیر نہیں لاتے، ابھی امی روز کہہ رہے تھے۔ شہزادہ جوان بخت نے مجھے اب اپنی میں رکھ لیا ہے۔ وہ شکار کو جانے والے ہیں، مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہے تھے لیکن کیسے جاؤں۔ نہ جوتا ٹھیک ہے نہ ٹوپی میں نے کہا تو لے آئیے بازار سے، کہنے لگے۔ تنخواہ ملے تو چچا سے پوچھوں !

قدسیہ بیگم ۔ ہاں، وہ پوری تنخواہ لا کر اپنے چچا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، وہ بیس روپے اس کی ماں، امجدی بیگم کو بھیج دیتے ہیں، باقی اس کے نام پر جمع کرتے رہتے ہیں، کہتے ہیں اس کی شادی کے لئے جمع کر رہا ہوں !

جمیلہ ۔ شادی کے لئے ؟ ــــــ لیکن وہ تو کہتے ہیں میں شادی ہی نہیں کرونگا۔

قدسیہ بیگم ۔ یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔

جمیلہ ۔ ہاں امّاں سچ، وہ کہہ رہے تھے، ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔

قدسیہ بیگم ۔ کیا کہہ رہا تھا ؟ تُو نے باہمّت نے چھیڑا ہوگا کچھ ؟

قدسیہ بیگم۔ تراب علی نہیں آیا کئی دن سے۔
جمیلہ۔ ہاں، اماں وہ نہیں آئے۔ اور میں تو چاہتی ہوں وہ نہ آیا کریں۔
قدسیہ بیگم۔ (دل زور زور سے دھڑکنے لگا) ارے بیٹی یہ کیوں؟ وہ کوئی غیر تو نہیں، تیرا عزیز ہے، بچپن کا ساتھی، ساتھ کا کھیلا ہوا، پہلے تو تم دونوں میں بڑی دوستی تھی، اب کیا ہوا؟
جمیلہ۔ ہوا تو کچھ نہیں لیکن وہ ہمیں اچھے نہیں لگتے جب آتے ہیں میرے کمرے میں ضرور پہنچتے ہیں، گھور گھور کر دیکھا کرتے ہیں، خواہ مخواہ کی باتیں کرنے لگتے ہیں، جہانگیر اور نور جہاں، روپ متی اور باز بہادر، خضر خاں اور دیول دیوی، لیلیٰ اور مجنوں شیریں اور فرہاد، نہ جانے کہاں کہاں کے قصے ایک ہی سانس میں سنانا شروع کر دیتے ہیں،!
قدسیہ بیگم۔ یہ تو واقعی بُری بات ہے!
جمیلہ۔ ہاں اماں مجھے یہ باتیں ذرا نہیں اچھی لگتیں، دیکھئے نا، آخر بخت میاں بھی تو عزیز ہیں، اور اتنے ہی قریبی عزیز جتنے تراب میاں۔
قدسیہ بیگم۔ ہاں اس میں کیا شک ہے؟ بخت سیدھا لڑکا ہے، میں اسے پسند کرتی ہوں۔
جمیلہ۔ واقعی بڑے اچھے آدمی ہیں وہ —— وہ کبھی آنکھ چار کرکے بات نہیں کرتے، کبھی میرے کمرے میں نہیں آتے، میں اگر کچھ پوچھنے ان کے کمرہ میں پہنچ جاتی ہوں، تو بہت تہذیب اور سلیقہ سے باتیں کرتے ہیں، انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی، نہ کہی جو مجھے بُری لگتی ہو، تراب میاں کی ایک اور بات بھی مجھے بہت بُری لگتی ہے، اماں! دیکھئے نا، جب آئیں گے، اپنی بڑائی بیان کرنے لگیں گے، میں ریزیڈنٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہوں صاحب

قدسیہ بیگم۔ کیا بخت کو بھی چھیڑتا رہتا ہے؟

جمیلہ۔ بہت زیادہ، لیکن وہ ایک مسکراہٹ میں اس کی تمام باتیں ٹال دیتے ہیں!

قدسیہ بیگم۔ ہاں یہ ابھی تو کیا کہہ رہی تھی، وہ شادی کرنے کو نہیں کہتا ——
کیا تو نے پوچھا تھا اس سے؟

جمیلہ۔ (شرما کر) واہ میں کیوں ایسی باتیں پوچھنے لگی؟ ایسی باتیں تو بخت ہی پوچھا کرتا ہے۔

قدسیہ بیگم۔ کیا پوچھا تھا اس نے؟

جمیلہ۔ کہنے لگا، بہت دنوں سے پلاؤ زردہ، اور نان گوشت نہیں کھایا ہے آپ کسی طرح شادی ہی نہیں کرتے جو یہ چیزیں کھانے کو ملیں۔ وہ کہنے لگے شادی ان کی ہوتی ہے۔ جن کا گھر بار ہو جن کے ماں باپ ہوں جن کے پاس روپیہ پیسہ ہو۔ یہ کہہ کر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے، چہرے سے معلوم ہوتا تھا بڑے پریشان اور فکرمند ہیں!

قدسیہ بیگم۔ اس کی شادی میں کروں گی، میں بخدا انہیں" دولاور علی خاں کو) سلامت رکھے، جب تک وہ زندہ ہیں اسے کسی بات کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، آخر ہم لوگ کس مرض کی دوا ہیں؟

جمیلہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے انہیں کوئی غم ہے؟ کوئی صدمہ ہے؟
میں نے اکثر دیکھا ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتے ہیں، کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو بھی جھلک آتے ہیں۔

قدسیہ بیگم۔ اچھا! —— ٹھنڈی سانسیں بھی بھرتا ہے؟ آنسو بھی آنکھوں میں جاتے ہیں؟

جمیلہ۔ نہیں یں تو ذرا بھی نہیں چھیڑتی ہاں ہمّت ضرور شوخی کرتا رہتا ہے لیکن وہ بُرا نہیں مانتے، خوش ہوتے ہیں داد دیتے ہیں ، !

قدسیہ بیگم۔ بڑا نیک لڑکا ہے ، !

جمیلہ۔ اور ایک وہ ہیں تراب میاں، ابھی چند دن ہوئے تشریف لائے تھے اپنی بہادری اور طرہ خانی کے افسانے سُنا رہے تھے، ہمّت بھی بیٹھا سُن رہا تھا۔ کہیں اس کے منہ سے نکل گیا" ہاں پھر جب آپ کی آنکھ کھلی تو کیا ہُوا ؟"

قدسیہ بیگم (ہنستے ہوئے) بڑا شریر ہے۔ آگ بگولہ ہی تو ہو گیا ہوگا تراب یہ باتیں سن کر ؟

جمیلہ۔ ہاں —— کہنے لگے، تم مذاق اڑاتے ہو میرا مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، میں آنا بند کر دوں گا اس گھر میں ، !

قدسیہ بیگم۔ اوئی، نہ آئیں گے، تو کون سا غضب ہو جائے گا، ؟ نہیں آئینگے۔ نہ آئیں، وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش ،

جمیلہ کہنے لگے، بڑے نالائق اور بدتمیز ہو، میرا گھر ہوتا تو پیٹ دیتا تمہیں۔

قدسیہ بیگم۔ آہا بڑے آئے پیٹنے والے میرے بچے کو، —— ذرا پیٹ کر تو دیکھیں —— ارے لڑکی تو نے یہ باتیں مجھے پہلے کیوں نہ کہیں ؟

جمیلہ۔ کیا کرتی کہہ کے، مفت میں صدمہ ہوتا آپ کو۔

قدسیہ بیگم۔ مجھے کیوں صدمہ ہونے لگا، ایسے بر خود غلط آدمیوں کی باتوں سے، ہاں، اگر بخت کہتا تو ضرور رنج ہوتا۔

جمیلہ۔ وہ ایسی باتیں کر ہی نہیں سکتے، میں ان کا مزاج پہچانتی ہوں،

قدسیہ بیگم۔ وہ بڑا سمجھ دار ہے۔ لڑکے اس سے ایسی باتیں کر بھی نہیں سکتے۔

جمیلہ۔ یہ تو نہ کہیئے اماں جان، یہ ہمّت بڑا شیطان ہے، کسی کو نہیں چھوڑتا۔

زینت محل اور بہادر شاہ

بہادر شاہ سب سے زیادہ زینت محل کو چاہتے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ بہت زیادہ خوبصورت تھیں بلکہ وہ زینت محل کے کردار سے محبت کرتے تھے۔ وہ زینت محل کی وفاداری کے ثنا خواں تھے، ان کے دل میں زینت محل کا جو نقش تھا، وہ اس کی بلند سیرت، اور بلند تر کردار تھا، وہ بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے، اور زینت محل نوجوان تھی، لیکن عمر کے اس تفاوت کے باوجود، دونوں کی روح میں ایسا اتحاد تھا، کہ معلوم ہوتا تھا، یہ دونوں صرف ایک دوسرے کے لئے عالم وجود میں آئے ہیں، زینت محل نہ ہوتی۔ تو بہادر شاہ کی زندگی، ایک ایسا ریگستان ہوتی، جو رنگ و بو سے محروم ہوتا، اور اگر بہادر شاہ نہ ہوتے، تو شاید زینت محل کی زندگی اور روح تشنہ تشنہ سی رہتی، دونوں کے سوچنے کا انداز اس حد تک یکساں تھا کہ زینت محل جب کوئی بات کہتی، تو بہادر شاہ محسوس کرتے، ــــــ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے! اور جب بہادر شاہ کچھ فرماتے، تو یوں لگتا، کہ جیسے اگر یہ بات بادشاہ سلامت نے نہ کہی ہوتی، تو خود زینت محل کی زبان پر ہوتی! زینت محل اور بہادر شاہ میں وہی نسبت تھی، جو اندلس کے محبوب و ہر دل عزیز فرمانروا عبدالرحمٰن الناصر اور اس کی روح و رواں زہرا میں تھی عبدالرحمٰن نے زہرا کے لئے "قصر زہرا" تعمیر کرایا تھا، جس کی تعمیر پر کروڑوں روپیہ صرف کر ڈالا،

جمیلہ۔ ہاں، ایک، دفعہ میں نے پوچھا بھی تھا، کہ آپ ہر وقت کھوئے کھوئے سے، پریشان پریشان سے کیوں نظر آتے ہیں؟ مگر میری طرف دیکھ چُپ ہو رہے، جیسے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہ سکے، نہ جانے کیا بات ہے؟

اتنے میں ہمت دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا۔

"بھائی جان آئے ہیں، !"

جمیلہ جانے کے لئے اُٹھی۔

"بھوکے ہوں گے، جاؤں کھانا دے آؤں جا کر، !"
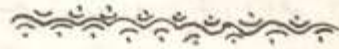
ایک تصویر کے دو رُخ

بہادر شاہ کثیر العیال آدمی تھے، بہت سی شادیاں کیں، بہت سی اولادیں ہوئیں، لال قلعہ کی آبادی، زیادہ تر انہی "مرشد زادوں" کی رہین منت تھی، جو شاہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، لیکن بہادر شاہ کی اولاد میں مرزا قویاش اور جوان بخت، اپنی فطرت، مزاج، عادات و خصائل، اور طینت و جبلّت کے اعتبار سے بالکل جُدا تھے، اولاد میں ہر طرح کا نمونہ ملتا تھا، اچھا بھی اور بُرا بھی، قابل تعریف بھی، اور لائق مذمت بھی، جوان بخت اور مرزا قویاش کی مثال ایسی تھی جیسے ایک سکّہ کے دو پہلو، ایک تصویر کے دو رُخ ——— ایک رُخ روشن، تابناک، اور باوقار، دوسرا رُخ تاریک چھچھورا اور قابل نفرت، ایک خود غرض تھا، جاہ پرست تھا، ملک و ملّت، دین و مذہب اور خاندانِ شاہی سب کو اپنے "مفاد" پر قربان کر دینے میں قباحت نہیں محسوس کرتا تھا، اور دوسرا اپنے مفاد کو، اپنی شخصیت کو، اپنی سربلندی کو اپنی امنگوں اور حوصلوں کو ملک و ملّت اور خاندان شاہی کے مفاد پر بے جھجک قربان کر سکتا تھا ——— یہ جوان بخت تھا، اور وہ مرزا قویاش، !

جوان بخت زینت محل کا لڑکا تھا، حُسنِ صورت میں ماں کا نمونہ، حُسنِ سیرت میں باپ کا نقشِ تمام! ——— قلعہ کے دوسرے شہزادے، شاعری میں، شاعری میں، کبوتربازی میں، طوائفوں کی سرپرستی میں، رقص و سرود میں، جوئے اور شطرنج میں ب[illegible]ی، در

اور جو آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی دُنیا کے ہر سیاح کے لئے ایک مجوبہ کم نہیں، بہادر شاہ نے زینت محل کے لئے، انگریزوں کا دستِ نگر بن جانے کے باوجود، لال کنویں پر، ایک شاندار محل تعمیر کیا تھا[1] جو اگرچہ اپنی شان و تجمّل میں قصرِ زہرا سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا لیکن خلوص و محبّت نے اس سادہ سی عمارت میں بھی ایک عجیب دلکشی اور شان پیدا کر دی ہے جو مرورِ ایّام سے کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی ہے زہرا بھی امورِ مملکت میں دخل دیتی تھی، خلیفہ کی خدمت میں اپنی رائے پیش کرتی تھی، کوئی معاملہ بہت اہم ہوتا تو اس پر اڑ جاتی تھی اس لئے کہ ملّی، و مُلکی مصالح کا تقاضا اسے یہی نظر آتا تھا اور یہی کیفیت زینت محل کی تھی، وہ اگرچہ ایک عورت تھی، لیکن صاحب الرائے، دُور اندیش معاملہ فہم اور صاحب عقل و فراست، وہ اکثر بادشاہ کو مشورہ دیتی۔ بلکہ بعض معاملات میں بادشاہ خود اس سے رائے لیتا، اور بعد کے واقعات ثابت کر دیتے کہ اس کی رائے کتنی صائب اور کتنی مُدبرانہ تھی! ——— یہی وجہ تھی کہ بادشاہ سلامت اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔

---

[1] دِلّی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنویں کے پاس اب بھی موجود ہے اس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دِلّی جانا ہوا اسی مکان میں برات ٹھہری تھی، فتح دہلی کے بعد یہ مکان گورنمنٹ نے سرکار پٹیالہ کو دے دیا اب بند پڑا رہتا ہے اور اتنے ہی کام کا ہے کہ کوئی شادی یا جلسہ ہوتا ہے تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں آ بیٹھتے ہیں، آبِ حیات صـ ۵۴۴

اور سارے ہندوستان میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایک مرتبہ پھر مغل حکومت کا ڈنکا بجنے لگے گا، اگرچہ اب تک اس کی ولی عہدی کا اعلان نہیں ہؤا تھا لیکن دِلّی والے دل ہی دل میں یہ یقین کر چکے تھے کہ ولی عہد وہی ہوگا اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، وہی اس منصب بلند کا مستحق ہے، اپنی بصیرت اور اہلیت کے باعث۔ وہ مسند شاہی پر متمکن ہو کر رہے گا، ولی عہدی کے لئے جواں بخت کا انتخاب، درحقیقت بہادر شاہ اور زینت محل نے نہیں کیا تھا، اہل دِلّی نے کیا تھا۔

اور وہ ذات شریف، مرزا قویاش، اگرچہ اسی باپ کے بیٹے تھے، جس کا نور نظر اور لخت جگر جواں بخت تھا لیکن عادات و اطوار کے لحاظ سے، کردار اور سیرت کے اعتبار سے ان میں اور جواں بخت میں وہی نسبت تھی، جو ذرّے اور آفتاب میں ہوتی ہے، کون سا ایسا فن تھا جس میں یہ پُورے نہ ہوں؟ آنکھیں لڑانے کے فن میں اپنی مثال آپ تھے، بادشاہ سے ہر مہینہ جو رقم ملتی، اس کے علاوہ کافی رقم، یہ گھر کی قیمتی چیز اونے پونے بیچ کر پیدا کر لیتے، اور یہ ساری رقم، خانم بازار کے بالا خانوں میں صرف ہو جاتی، طبلہ کی تھاپ اور گھنگرو کی چھنک چھن سے انہیں جو دلچسپی تھی، وہ تلوار کی جھنکار اور بندوق کے دھماکہ سے نہ تھی، البتہ سازش کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بادشاہ سے رزیڈنٹ کی شکایت کرتے، رزیڈنٹ سے، اپنے باپ اور بادشاہ کے بھید ہی ہن کر لنکا ڈھانے کی کوشش کرتے، مرحوم ولی عہد، مرزا فخرو کے پس ماندگان کو پٹی پڑھاتے رہتے کہ، بادشاہ کے خلاف ایک محضر تیار کریں، اور گورنر جنرل کے ذریعہ کمپنی بہادر کو بھیج دیں، شہر میں جب کبھی نکل جاتے تو لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر جل جاتے اور آگ بگولہ ہو کر واپس آتے، انہیں معلوم تھا، جواں بخت کی کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے، اور ان کی وہ منزلت بھی نہیں تھی، جو ایک شہزادے کی ہونی چاہیئے۔ یہ رنگ دیکھ کر بجائے اس کے کہ جواں بخت کی سی زندگی اختیار کرنے

سازش میں جوڑ توڑ اور ریشہ دوانی (؟) میں، سیر و شکار، اور تفریح و مجلس آرائی میں اپنا وقت صرف کرتے تھے، اور جواں بخت، اپنے وقت کا بڑا حصہ پڑھنے لکھنے میں، بزرگوں اور عالموں کی صحبت میں، فنونِ جنگ کی تعلیم و تربیت میں، اور مملکت کے مسائل مہمہ پر غور و فکر کرنے میں صرف کرتا تھا، وہ اگرچہ جوان تھا، اور بانکا جوان تھا لیکن دوسرے شہزادوں کے برعکس نہ اس نے کبھی شراب کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مشہور یا گمنام طوائف کا دیدار کیا، نہ اسے شعر و شاعری اور مشاعرہ بازی سے کوئی دلچسپی تھی، نہ کبوتر بازی سے کسی طرح کا لگاؤ تھا، وہ بڑا اچھا شہسوار تھا، وہ بڑا کامیاب تیر انداز تھا، وہ مانا ہوا نیزہ باز تھا، بندوق کا نشانہ ایسا صاف تھا کہ اڑتی ہوئی چڑیا پر شرط بد کے نشانہ لگاتا اور وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی آن کی آن میں زمین پہ آرہتی۔ خاندان شاہی کے متوسلین میں بہت سے ایسے تھے، جو تباہ حال اور آشفتہ روزگار تھے، جواں بخت ان کے حالات معلوم کرتا، ان کی مدد کرتا، ماں سے پوچھے اور باپ کے علم بغیر وہ نجانے کتنی بیوہ عورتوں کی مدد کرتا، کتنے اپاہجوں اور ناچاروں کی دستگیری کرتا، کتنے مفلوک الحال لیکن سپید پوش لوگوں سے چھوٹے چھوٹے کام لیکر بڑی بڑی رقمیں عطا کرتا، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی قلعہ سے نکل کر وہ شہر میں جاتا، لوگ عقیدت اور محبت کی نظر سے دیکھتے، جدھر سے وہ گزر جاتا، فرطِ محبت اور احترام سے گردنیں خم ہو جاتیں، لوگوں کو یہ تمنا رہتی کہ، ایک نظر جواں بخت کو دیکھ لیں، یہ لوگ دل سے دعا کرتے کہ دلی کا چراغِ سحری ——— بہادر شاہ ——— جب خدانخواستہ گل ہو تو، اس سے جو نیا چراغ جلے، وہ جواں بخت کی صورت میں، اس کی جوت اور چمک دمک سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھے، بادشاہ کی ذات اب ڈھلتا سایہ تھی، ان میں نہ امنگ تھی، نہ حوصلہ، نہ جوش و خروش، نہ عزم و تہوّر، امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز اب صرف جواں بخت تھا، یہ جب تخت پر بیٹھے گا، تو یہ کرے گا، وہ کرے گا، یہ انگریزوں کو کان پکڑ کر نکال دے گا

مرزا قویاش

آج مرزا قویاش بہت خوش تھے، رزیڈنٹ مسٹر ہاروے کے دردولت سے ابھی ابھی واپس آئے تھے، یارانِ سرپل کا مجمع تھا مصاحب اور ندیم گھیر میں آئے ہوئے تھے، مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مرتضیٰ علی بیگ ان ندیموں مصاحبوں کے سردار تھے، یہ مرزا قویاش پر بہت زیادہ حاوی تھے، انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"حق بحقدار رسید آخر ہمارے شہزادہ کا حق تسلیم کر لیا گیا کمپنی بہادر نے انہیں ولی عہد مان لیا۔ بخدائے لایزال مجھے حیرت ہوتی ہے کہ باپ ہو کر بادشاہ سلامت نے ایسی ناانصافی کیسے روا رکھی، کہ بڑے بیٹے کا حق سوخت کر دیا، اور چھوٹے بیٹے کو گدی دے دی، بھلا یہ کوئی اصول ہے۔ انصاف ہے؟ کم از کم مغل خاندان میں تو اس طرح کی بے انصافی کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔"

ایک دوسرے تیز طرار ندیم نے تال میں تال اور سر میں سر ملاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"ہاں صاحب ایسی دھاندلی تو نہ ہم نے کبھی نہ دیکھی نہ سُنی، لیکن اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا، جواں بخت کو، اور ان کی مادر محترمہ زینت محل کو، اور ان کے پدر بزرگوار جہاں پناہ سلامت کو، آج مرزا قویاش ولی عہد سلطنت ہیں، اور کل

کی کوشش کرتے اس سے روٹھ جاتے، اور اس کا قلع قمع کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتے بہادر شاہ نے انہیں راہ راست پر لانے کی بہتیری کوششیں کر ڈالیں، لیکن یہ ماش کے آٹے کی طرح اکڑے رہے، کیا مجال ہے جو ان کے لچھنوں میں کوئی فرق آیا ہو، وہی رفتار، وہی اطوار، وہی لیل و نہار، !

جواں بخت کے مصاحبوں میں وہ لوگ تھے جو شرفا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ اچھے تعلیم یافتہ، نیک، صالح، وفادار اور مخلص تھے، یہ لوگ جب شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو کبھی قلعہ کی اندرونی سازشوں، کیفیتوں کا حیرت اور افسوس کے ساتھ تذکرہ ہوتا، اور اس کا مداوا سوچا جانے لگتا کبھی بادشاہ سلامت کی درازیٔ عمر و ترقیٔ اقبال کی دعائیں مانگی جاتیں، اور ان کی ذات سے دل خوش کن امیدیں اور توقعات قائم کی جاتیں، !

لیکن مرزا قویاش کی محفل کا رنگ بالکل ہی کچھ اور تھا! یہاں نہ ملک سے کوئی سروکار تھا، نہ ملت سے، نہ علم سے نہ عمل سے، یہاں صرف ایک ہی مسئلہ پر بحث ہوتی تھی، یہ بڑے میاں، بہادر شاہ ـــــــ کب اس دنیا سے رخصت ہونگے کہ مسند حکومت قبضہ میں آئے؟ جواں بخت کو کس طرح زہر دیا جائے کہ وہ اس عالم فانی سے رخصت ہو کر، راستہ صاف کر دے؟ رزیڈنٹ کو کس طرح قابو میں لایا جائے؟ گورنر جنرل سے ملاقات کی کیا سبیل نکالی جائے؟ کپتنی بہادر کو کیونکر اپنی طرف ملتفت اور متوجہ کیا جائے! ؟

~~~~~~~~
~~~~~~~~

واہ صاحب واہ، آپ بھی خوب آدمی ہیں، آپ نے یہ بھی سوچا، یہ باتیں کس سے کر رہے ہیں؟ کون ہے مخاطب آپ کا؟

جھبّو خاں، بھلا وفاداری کے اس نازک موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر بادل کی طرح گرجے۔

" اچھی رہی یہ بھی بھئی، کیا زمانہ ہے، واقعی قیامت قریب آگئی ہے، آقائے ولی نعمت کے سامنے یہ باتیں، اسی لئے تو مسلمانوں پر تباہی آرہی ہے، نمک حلالی وفاداری اور جاں نثاری کا سبق ہم بالکل بھول چکے ہیں ——— بالکل ———!

تہوّر حسین نے برجستہ جواب دیا۔

" خان صاحب، آپ کے اور آپ کے رفقاء کے بارے میں میرا ہمیشہ سے یہی خیال تھا۔"

خان صاحب پہلے مسکرائے، پھر سوچ کر چونکے،

" یعنی ہم وفادار، اور نمک حلال نہیں ہیں؟ ——— کیوں جناب آپ کا یہی مطلب ہے نا؟"

تہوّر حسین نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے دبدبہ کے ساتھ جواب دیا۔

—— " ہاں "

اور اس کے تیور دیکھ کر خان صاحب اور بیگ صاحب، یوں دبک گئے، جیسے چوہا بلّی کو دیکھ کر دبک جاتا ہے، مرزا قوباش نے برہم نظروں سے دونوں کو دیکھا، اور فرمایا:۔

" ہم تخلیہ چاہتے ہیں!"

دونوں کان دبا کر چلتے بنے، اب مرزا قوباش اور تہوّر حسین رہ گئے۔

مرزا قوباش نے کہا، سمجھ میں نہیں آتا تم اتنے برہم کیوں ہو، تم سے بڑھ کر ہم

انشاالله وہ مبارک گھڑی آئے گی کہ تختِ حکومت پہ جلوہ گر ہوں گے، !

انہی لوگوں میں ایک اور شخص بھی تھا، مرزا قو باش کے دل میں ولی عہدی کی لگن اسی نے پیدا کی تھی، بدنفسی، اور خباثت سے نہیں، خلوص اور نیک نیتی سے، مرزا قو باش کے اور اس کے کچھ ایسے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ کہ وہ ولی عہدی کے منصب پر کسی اور کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا، اور اپنی دوستی میں، اتنا کھرا اور ریکا تھا کہ اگر وقت پڑ جاتا تو جب دوسرے نمک خوار ندیم و مصاحب بھاگ رہے ہوتے یہ جاں نثاری اور فداکاری پہ آمادہ ہو جاتا، لیکن اب کہ اس کی تمنّا پوری ہو گئی تھی، یہ گم سم اور افسردہ خاطر نظر آرہا تھا، مرزا قو باش نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ندیموں اور مصاحبوں سے کہا۔

" تم لوگوں کی مبارک باد کا بدولت شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن دل میں جو امنگ اور ترنگ تہوّر حسین کی مبارک باد سے پیدا ہو سکتی تھی، وہ اب تک پیدا نہیں ہوئی، آخر، یہ کیوں خاموش ہیں ـــــ؟ تہوّر میاں تمہاری یہ خاموشی ہمیں کھل رہی ہے یہ وقت تھا کہ رقص و سرور کی محفل جمتی، بادۂ ناب کا دور چلتا، گیت اور سنگیت کے چرچے ہوتے، نشاط و مسرّت اور خوشی کا طوفان اُٹھتا، لیکن تم چپ ہو، سکوت چھایا ہوا ہے تم پر ـــــ" افسردہ کن انجمنے یا! تم نے ہماری طبیعت میں بھی تکدر اور تنغص پیدا کر دیا، آخر تمہاری زندہ دلی اور خوش طبعی کو آج کیا ہو گیا ہے؟"

تہوّر حسین نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ مرزا قو باش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
" کاش اس ہنگامۂ مسرّت میں، یہ غلام شریک ہو سکتا، کاش وہ دل کی گہرائیوں سے مبارکباد کا نذرانہ پیش کر سکتا"

مرتضیٰ علی بیگ تڑپ اُٹھے۔

لیا، تو کم از کم غلام سے اس کی توقع نہ رکھی جائے!"

یہ باتیں مرزا قویاش غور سے سنتے رہے، پھر انہوں نے تہور حسین کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر، بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"تہور، تم نہیں جانتے ہم نے کیا کیا ہے، اور کیوں کیا ہے"؟

رموزِ مملکتِ خویش خسروان دانند؟

اگر ہم ان شرائط کو مسترد کر دیتے تو کوئی دوسرا شہزادہ ان سے بھی پست شرائط قبول کر لیتا، تم قلعہ کے حالات جانتے تو ہو!"

اس جواب سے تہور حسین مطمئن نہیں ہوا، اس نے کہا صاحب عالم! میں ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا شہزادہ ایسی حرکت کرتا تو قیامت تک کے لئے بدنامی کا سہرا اس کے سر بندھتا، کم از کم میرے آقا مرزا قویاش کے دودھ کی طرح سفید دامن پر کوئی دھبہ نہ لگتا!

یہ کہتے کہتے تہور حسین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مرزا قویاش نے جانے کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو، بادشاہ سلامت کے انتقال کے بعد، تخت حکومت ہی کو ملے گا، انگریزوں نے یہ شرط ہم سے اس لئے نہیں منوائی ہے کہ اس پر عمل کریں، اس لئے منوائی ہے کہ ہماری وفاداری کا امتحان کریں، یہ دیکھیں کہ ہم ان کی بات کس حد تک مان سکتے ہیں؟ چنانچہ جب یہ شرطیں میں نے مان لیں، تو مسٹر ہاروے کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا، انہوں نے بڑی گرم جوشی سے رخصتی مصافحہ کیا، اور کہا ہم گورنر لارڈ کیننگ کی طرف سے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری "بہترین خواہشات" آپ کے ساتھ ہیں، سوچو تو سہی، ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ بہترین خواہشات"، کیا ہو سکتی ہیں جو ہمارے ساتھ ہیں، یہی کہ ہم ان کے زیر سایہ بادشاہت کریں، ہمارے سر پہ

کسی کو اپنا مخلص، اور رفیق نہیں سمجھتے، ہمارا خیال تھا تم ہم سے بھی زیادہ خوش اور مسرور وشاداں نظر آؤ گے لیکن تمہارا یہ سکوت، یہ برہمی، یہ طریقہ کچھ عجیب سا نظر آرہا ہے! تم آج ہمیں تہور حسین نہیں نظر آتے، کچھ اور دکھائی دیتے ہو۔ اور ہم یہ کہنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں کہ ہمیں اس کا صدمہ ہے!"

تہور حسین نے پہلو بدل کر اور پہلے سے زیادہ ہو کر عرض کیا، صاحب عالم سے زیادہ اس حقیقت کا کون شناسا ہو سکتا ہے؟ یہ غلام صرف ایک ہی تمنا رکھتا تھا۔ یعنی یہ کہ اپنے دوست اپنے مخدوم، اپنے آقا، مرزا قویاش کے سر پر تاج خسروی دیکھے، اس مقصد کے لئے اس نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، اور نہ زندگی کی آخری سانس، اور خون کے آخری قطرہ تک وہ کسی قربانی سے دریغ کر سکتا تھا!"

مرزا قویاش نے اعتراف کے طور پر گردن ہلاتے ہوئے کہا "ہمیں اس بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس وقت اپنے زندہ ہونے کا، لیکن پھر تمہاری یہ تمنا سرد کیوں پڑ گئی؟ تمہاری یہ اُمنگ ختم کیوں ہو گئی؟ اب تمہاری نظر میں، ہم اس اعزاز اور منصب کے اہل نہیں رہے؟"

تہور حسین نے جواب دیا "یہ تو نہیں عرض کر سکتا لیکن یہ کہ آپ نے خود اس منصب کو ٹھکرا دیا، مسٹر ہاروے نے جن شرائط پر آپ کی ولی عہدی منظور کی ہے کیا وہ اس قابل تھے کہ آپ انہیں منظور کر لیتے؟ بادشاہ سلامت کے انتقال کے بعد آپ بادشاہ نہیں کہلائیں گے، یہ لال قلعہ، جو مغل خاندان کی عظمت وشوکت کا زندہ جاوید نشان ہے، آپ سے خالی کرا لیا جائے گا، آپ کا ماہانہ وظیفہ ایک لاکھ کی بجائے پندرہ ہزار کر دیا جائے گا پھر بھی آپ خوش ہیں کہ ولی عہد مان لئے گئے، اور آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس پر خوش ہوں، آپ نے مغل خاندان کا خاتمہ منظور کر

محل کے اندر!

آج بادشاہ سلامت، زینت محل کے مکان میں رونق افروز ہیں، کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا، وہ لال قلعہ سے، ایک آدھ روز کے لئے، لال کنویں پر، زینت محل کے مکان میں قدم رنجہ فرماتے تھے، اور دو ایک دن قیام کر کے واپس چلے جاتے تھے، اس وقت بادشاہ سلامت، اپنے خاص کمرہ میں رونق افروز تھے، حکیم احسن اللہ خاں، نواب حامد علی خاں، مرزا الٰہی بخش، محبوب علی خاں، خواجہ سرا، اور چند دوسرے اعیان و اکابر حاضر خدمت تھے، زیر بحث بھی ولی عہدی کا مسئلہ تھا، بادشاہ گورنر جنرل کے اس غیر منصفانہ فیصلہ سے بہت ملول و افسردہ تھے، انہوں نے بڑے سوز و تأثر کے عالم میں فرمایا:-

"یہ زندگی روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے، تیموری خاندان ایک دن یوں بے بس ہو جائے گا؟ اس کا اندازہ بھی کوئی نہ کر سکتا تھا، ہم نے ان انگریزوں کے ساتھ کیا کیا! اور یہ ہمارے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ ہم نے انہیں تجارت کی اجازت دی، پھر انہیں اپنا دیوان بنا لیا، دیوانی حاصل کرنے کے بعد یہ کھیل کھیلے، بظاہر اس لئے آئے تھے کہ مرہٹوں سے ہمیں بچائیں، اور حقیقتاً انہوں نے ساری مملکت پر قبضہ کر لیا۔ ہم نے اسے بھی برداشت کیا، جنّت آرام گاہ، اکبر شاہ نے انہیں اتنی ڈھیل دی کہ جب ہماری ولی عہدی کا سوال پیدا ہوا تو انہوں نے اڑچن لگائی، مگر کامیاب نہ ہو سکے، رفتہ رفتہ یہ ہمیں بندہ بے دام سمجھنے لگے، اور اب انہوں نے آخری وار کیا ہے۔ مرزا

تاج شہر یا ہی رکھ دیا جائے۔ اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تہور حسین ہمیں اپنے مفاد کا تم سے زیادہ خیال ہے، تاج و تخت سے محرومی تمہارے لئے اتنی تکلیف دہ نہیں ہو سکتی، جتنی ہمارے لئے، پھر اگر ہم اس پر راضی ہو گئے تو کیوں؟ محض اس لئے کہ اگر ساری جاتی ہو تو آدھی نہ چھوڑنی چاہیئے، اس طرح آدھی اور ساری دونوں سے ہاتھ دھونا پڑتا، اور اگر آدھی لے لی جائے تو پھر ساری کے ملنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ تہور حسین میاں! ہم نے عقلمندی اور تدبر سے کام لیا ہے، جلدبازی اور بے وقوفی سے نہیں۔ کوئی آدمی خوشی سے ایک روپیہ بھی نہیں چھوڑتا پھر ہم اتنی بڑی حکومت کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟"

یہ کہہ کر مرزا صاحب شاداں و فرحاں، اپنے عشرت کدہ میں تشریف لے گئے، اور تہور حسین اپنے گھر واپس آ گیا، راستہ بھر وہ مرزا قویاش کی باتوں پر غور کرتا رہا، لیکن کسی بات پر بھی دل نہ جما، ہر دلیل بودی اور کمزور نظر آئی۔ یہ یقین پختہ ہو گیا کہ مرزا نے اپنے باپ سے، اپنے خاندان سے، اپنے ملک و قوم، اور تخت شاہی سے غداری اور بیوفائی کی ہے، اور صرف اپنی زندگی عیش سے بسر کرنے کے لئے، قوم اور ملک کے مفاد کو قربان کر دیا ہے، وہ جب قلعہ میں داخل ہوا تھا، تو اس کا دل، مرزا قویاش کی محبت سے معمور تھا، اور اب جب وہ لال قلعہ کے پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا، اس کی نظر میں دنیا کا کوئی شخص مرزا قویاش سے زیادہ قابل نفرت نہیں تھا،

تھے، وہ غدار ہیں، جو ممنون کرم تھے وہ آزاد اور خود مختار ہیں، یہ دیکھ کر، یہ سوچ ہم نے لال قلعہ کے محل کو، گوشہ عافیت بنایا، تسبیح و نماز کو اپنا وظیفہ حیات قرار دے لیا، قناعت اور فقر کی زندگی پسند کر لی پھر بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے جو نذر ہمارے حضور میں پیش کی جاتی تھی، وہ بند کر دی گئی، ریزیڈنٹ جب خط لکھتا تھا، تو اپنے تیئں ہمارا فرزند لکھتا تھا، یہ ایک رسمی سی بات تھی، لیکن اب اس کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا، یہ قلعہ نہیں خانقاہ ہے، اور اس خانقاہ کا مجاور، ہم نے اپنے چہیتے بیٹے جواں بخت کو بنایا تھا، لیکن یہ انگریز لوگ، اب مجاوری کا سلسلہ بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ رونے کا مقام یہ ہے۔ کہ ان ساری کارروائیوں میں ہمارا بیٹا مرزا قویاش برابر کا شریک ہے۔ ہم بوڑھے ہو چکے زندگی سے طبیعت سیر ہو چکی، مگر موت کس طرح نہیں آ سکتی، اسے موت آ بھی جائے تو کیا ہوگا؟ قویاش کی ناخلفی، اور غداری لحد میں بھی چین نہ لینے دے گی، خوب کہا ہے۔ استاد ذوق نے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حکیم صاحب! آپ کے مسٹر ہاروے سے بڑے گہرے تعلقات ہیں، آپ انہیں سمجھائیے کہ انسانیت کی حد سے اتنے نہ گذریں کہ فطرت انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے،،

یہ سن کر حکیم صاحب کی پیشانی پہ عرق انفعال کے قطرے چمکنے لگے اور دوسرے حاضرین بھی کہ ان میں سے اکثر، درپردہ انگریزوں کے حامی اور جاسوس تھے، شرما گئے۔ لیکن حکیم صاحب نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور فرمایا:۔

" غلام کے مسٹر ہاروے سے جو کچھ بھی تعلقات ہیں وہ تخت شاہی کے واسطے سے ہیں، اس کی مجال نہیں کہ بادشاہ والا جاہ کے کسی ارشاد کی تکمیل نہ کرے، ہیں ضرور ہاروے

قویاش کی ولی عہدی اس شرط پر تسلیم کی ہے کہ وہ ہمارے مرنے کے بعد بادشاہ نہیں بنائے گا، صرف شہزادہ کے خطاب سے مخاطب کیا جائے گا، لال قلعہ چھوڑ دے گا، اور جہاں انگریز کہیں گے، وہاں رہے گا، وظیفہ کی رقم ایک لاکھ ماہوار سے گھٹا کر پندرہ ہزار رہ جائے گی، اگر اس کمبخت کو پندرہ ہزار روپے مطلوب تھے، تو ہم جوان بخت کو وصیت کر دیتے کہ وہ اسے پندرہ ہزار مہینہ دیتا رہے لیکن اس نے تو یہ رقم لے کر لٹیا ڈبو دی، خاندان تیموری کا چراغ گل کر دیا، کاش یہ پیدا نہ ہوتا، اور اگر پیدا ہوا تھا، تو اس دنیا میں آتے ہی مر گیا ہوتا، نالائق اور ناخلف اولاد والدین کے لئے ایک لعنت ہوتی ہے!"

یہ کہتے کہتے جہاں پناہ بادشاہ سلامت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حاضرین پر سکتہ سا طاری تھا، اور ان سب کی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔ ان کے سامنے تخت تیموری کا وارث پیکر حسرت بنا بیٹھا تھا۔ یہ اپنے اسلاف سے کتنا مختلف تھا۔ بابر۔ اکبر، شاہ جہاں اور عالمگیر کا جانشین اب اتنا بے بس تھا، کہ وہ اپنا ولی عہد بھی مقرر نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر دنیا کی بے ثباتی کیا ہوگی، بادشاہ نے رومال سے پہلے آنسو پونچھے، پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے جب تخت شاہی پر قدم رکھا، تو سمجھ لیا تھا، حالات بدل چکے ہیں، زمانہ بدل چکا ہے، ہماری قوت پارہ پارہ ہو چکی ہے، ہمارے وزیر بادشاہ بن چکے ہیں، ہمارے امیر خود مختار ہو چکے ہیں، ہماری باجگذار ریاستیں، حریت اور استقلال کا پرچم لہرا رہی ہیں، اور ایک نئی قوت، جو غیر ملکیوں کی ہے، ابھر رہی ہے، ہم میں اتحاد ہوتا اتفاق ہوتا باہمی اعتماد ہوتا تو ہم اس قوت کو تباہ کر سکتے تھے، اپنی گزشتہ عظمت پھر حاصل کر سکتے تھے، لیکن ہم جانتے تھے، کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کسی سے اُمید نہیں باندھی جا سکتی، کسی سے توقع نہیں تا ہم کی جو ملازم تھے وہ باغی ہیں جو ساتھی

ورنہ ایسا جو بنایا ــــــ نہ بنایا ہوتا

محبوب علی خان خواجہ سرا سے بادشاہ نے فرمایا، ملکہ زینت محل سے کہو ہم انہیں یاد کرتے ہیں، اور ہاں، اگر جواں بخت ہو تو اسے بھی بھیج دینا خواجہ سرا تسلیمات اور کورنش بجالا کر رخصت ہوا، ذرا دیر میں آگئیں، جواں بخت کہیں باہر گیا تھا وہ حاضر نہ ہو سکا، بادشاہ نے محبّت بھری نظروں سے زینت محل کو دیکھا اور فرمایا

" ملکہ تمہیں صدمہ تو بہت ہوا ہو گا گورنر جنرل کے فیصلہ سے "

ملکہ نے جواب دیا۔

" نہیں جہاں پناہ، صدمہ نہیں ہوا، غصّہ آیا، یہ لوگ ہماری غیرت اور ہمت کا امتحان لے رہے ہیں "

بہادر شاہ۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔ خدا امتحان لے رہا ہے ہمارے صبر و ضبط کا ہمارے تحمّل اور برداشت کا،!

زینت محل۔ میں دیکھتی ہوں، آپ پر یاس غالب ہے جہاں پناہ،!

بہادر شاہ۔ ملکہ تمہارا خیال صحیح ہے جب آدمی ہر طرف سے محصور ہو جاتا ہے جب امید منقطع ہو جاتی ہے، جب دوست ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب جان نثار ہونا برائے نام رہ جاتے ہیں جب اپنی اولاد غدّاری، اور جاسوسی پہ کمر باندھ لیتی ہے جب ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں، تو انسان واقعی مایوس ہو جاتا

صاحب سے ملوں گا، لیکن مناسب یہ ہوتا کہ جارج طامس صاحب[1] اس گفتگو کو چھیڑتے، تو شاید زیادہ خوش گوار نتیجہ برآمد ہوتا،!

بادشاہ نے کہا، وہ ناکام ہو چکا ہے، بار وے صاحب اس سے خفا ہیں کہ وہ انگریز ہو کر، ہمارا ساتھ دیتا ہے، اس سے انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ اس سے ملاقات نہیں کیا کریں گے،

مرزا الٰہی بخش اگرچہ بادشاہ کا مقرب بنا ہوا تھا لیکن حقیقتاً یہ بھی درپردہ انگریزوں سے ساز باز رکھتا تھا اور بادشاہ اپنی سادگی کی وجہ سے، اسے اپنا جان نثار معتمد اور رفیق سمجھا کرتے تھے، اس نے کہا :-

ظل اللہ، غلام کی رائے یہ ہے کہ جارج طامس کو گورنر جنرل کے پاس کلکتہ بھیجا جائے اصل اختیارات تو انہی کے ہاتھ میں ہیں، ریزیڈنٹ وہی کرے گا جو حکم ہو گا!"

بادشاہ نے کہا ـــــ نہیں جارج وہاں بھی نہیں جا سکتا، اس لئے کہ ریزیڈنٹ نے بتا دیا ہے، کہ ولی عہدی کا مسئلہ آخری طور پر طے ہو چکا ہے، لہٰذا اس پر گورنر جنرل گفتگو کرنا پسند نہیں کریں گے، خیر کوئی مضائقہ نہیں کر لیں، یہ لوگ جو چاہیں، اگر خدا کوئی چیز ہے تو یہ سفاکی بالا بالا نہ جائے گی،!"

یہ کہہ کر بادشاہ نے تسبیح ہاتھ میں لے لی، اس کے معنی یہ تھے کہ اب مجلس برخواست ہونی چاہیئے، سب لوگ آداب اور تسلیمات بجا لائے، اور اُلٹے پاؤں واپس[2] چلے گئے!

---

[1] بہادر شاہ نے اس نام کا ایک انگریز ملازم رکھا تھا کہ وہ ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل وغیرہ سے ترجمان بن کر گفتگو کیا کرے،!

[2] بادشاہ کی طرف پیٹھ کر کے واپس جانا بے ادبی سمجھا جاتا تھا،!

اسس کا، !

زینت محل۔ تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ نے انگریزوں کا فیصلہ منظور کر لیا ہے؟

بہادر شاہ۔ ہم نے احتجاج کیا ہے، ہم نے منظور کرنے سے انکار کیا ہے۔

زینت محل۔ آپ کو بھی معلوم ہے کہ قویش نے کن شرائط پر ولی عہدی قبول کی ہے۔

بہادر شاہ۔ سلطنت تیموری کو فروخت کر کے ؟

زینت محل۔ کیا آپ اسے بھی منظور کریں گے کہ لال قلعہ پر تالا لگ جائے، مسندِ حکومت دوسرے لوگوں کے قبضہ میں چلی جائے ؟

بہادر شاہ۔ تم ایک بے بس آدمی سے منظوری کے بارے میں کیوں پوچھتی ہو؟ کوئی آدمی جب قتل کیا جاتا ہے تو کیا اس کی منظوری حاصل کر لی جاتی ہے؟ میں قتل کیا جا رہا ہوں، میری حکومت قتل کی جا رہی ہے، میرا خاندان قتل کیا جا رہا ہے، میرے خاندان کی عزت و عظمت سب کی گردن پر چھری پھیری جا رہی ہے لیکن میں قاتل کی تلوار نہیں پکڑ سکتا، اس لئے کہ بھر سر کے ساتھ انگلیاں بھی کٹیں گی، بتاؤ میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں ؟

زینت محل۔ جب مرنا ہی ہے تو مار کر کیوں نہ مریں !

بہادر شاہ۔ بڑی اچھی تجویز ہے، لیکن مارنے کے لئے تلوار چاہیئے، اور ہمارے پاس تلوار تو بڑی چیز ہے، لاٹھی بھی نہیں، کس چیز سے ماریں ؟ کیا پھونک مارنے دیں ؟

زینت محل۔ طاقت پیدا کی جا سکتی ہے ؟

بہادر شاہ۔ کس طرح ؟ —— بتاؤ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو یقین کرو، ہم کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے !

زینت محل۔ یہ تو سچ ہے کہ ہندوستان کی ساری ریاستیں انگریزوں سے مل چکی ہیں سارے

پاس ہی اسے اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے'!

زینت محل ۔ مانتی ہوں جہاں پناہ ، ہم کمزور ہیں ، ہمارے وسائل ختم ہو چکے ہیں ، ہمارے دوست اور ساتھی غداری اور بے وفائی پر آمادہ ہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے خلقت اپنے بادشاہ سے کتنا پیار کرتی ہے ؟ کتنا چاہتی ہے کتنی عقیدت رکھتی ہے اس سے '!

بہادر شاہ ۔ ٹھنڈی سانس بھر کر ٹھیک کہتی ہو ملکہ ، لیکن یہ خلقت بھی ہماری طرح بے بس اور مجبور ہے ، جس طرح ہم کچھ نہیں کر سکتے ، یہ بھی نہیں کر سکتی !

زینت محل ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ، آپ کے ایک اشارۂ چشم پر یہ مخلوق سر سے کفن باندھ کر حاضر ہو جائے گی ، اور خون کا آخری قطرہ تک اپنے بادشاہ پر نثار کر دے گی ، میں نے عوام کی عقیدت کے ایسے دلکشا اور روح پرور مناظر دیکھے ہیں جو میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں '!

بہادر شاہ ۔ ہم تمہاری رائے کو غلط تو نہیں کہتے ملکہ ، ——— تم سچ کہتی ہو ، ٹھیک کہتی ہو ، رعایا کو ہم سے جو عقیدت ہے ، اور ہم نے جو والہانہ مناظر دیکھے ہیں ، تاحیات ہم بھی نہیں بھول سکتے لیکن سوچو تو یہ لوگ ہمارے لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتر سکتے ہیں ، اور ہمارے لئے اپنی گردنیں کٹا سکتے ہیں لیکن کسی کی گردن خواہ مخواہ کٹوا دیں ہم تو یہ نہیں کر سکتے ، دشمن کے ساتھ تربیت یافتہ فوج ہے ، ہندوستان کے ہندو مسلمان راجواڑے ہیں ، دولت ہے ہتھیار ہیں ، وہ ان سب کو لے کر میدان میں آئے گا ، اور ہماری رعایا ، ہمارے عوام کے پاس جذبۂ عقیدت کے سوا ، اور کیا ہوگا ؟ نہ شمشیر و سنان ، نہ ساز و سامان جنگ ، نہ عسکری تربیت نہ دولت و ثروت ، ہمارا مقصد صرف یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے لئے خلق خدا کی جان لے لیں ، جس سے نہ ہمارا بھلا ہو ، نہ

ہندوستان پر انہوں نے اپنی تلوار اور بندوق کی دہشت قائم کر دی ہے لیکن ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو ان سے نفرت کرتا ہے، ان کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے، ان کی قوت ختم کر کے انہیں یہاں سے نکال باہر کر دینا چاہتا ہے کیا اس کا تعاون ہم نہیں حاصل کر سکتے؟

بہادر شاہ۔ بگم، خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو تم عورت ہو تمہیں حالات کا اندازہ نہیں، تم انگریزوں کی درندگی اور سفاکی سے ناواقف ہو تم اپنی کمزوری اور بے بسی سے بھی ناواقف ہو، تم یہ بھی نہیں جانتی کہ ہماری ہندو اور مسلم رعایا کا با اثر اور طاقت ور طبقہ دل و جان سے انگریزوں کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ سے فائدہ حاصل کرتا رہتا ہے ہم نے اگر کوئی جنبش کی تو قیامت برپا ہو جائے گی،

زینت محل۔ کیسی قیامت! کیوں برپا ہو گی وہ؟

بہادر شاہ۔ اس لئے کہ بڑی قوت چھوٹی قوت کو کچل دیتی ہے، پامال کر دیتی ہے گلا گھونٹ دیتی ہے اس کا!

زینت محل جواب میں کچھ کہنے والی تھی کہ محبوب علی خواجہ سرا حاضر ہوا، اور اس نے دست بستہ عرض کیا، آج حکیم احسن اللہ خاں کے ہاں مشاعرہ ہے اور جہاں پناہ نے اپنی غزل مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا تھا، استاد ذوق، غالب، مومن، وغیرہ سب پہنچ چکے ہیں، صرف ظلِ سبحانی کے کلام کا انتظار ہے۔

بادشاہ نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر محبوب علی خاں کی طرف بڑھایا اور فرمایا،

"یہ چند شعر ہیں، بھیج دو!"

کلام بھیج دیا گیا اور مشاعرہ میں بادشاہ کی طرف سے سُنایا گیا، حاصل مشاعرہ

یہی چند شعر قرار پائے، جس نے سُنا، اس پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ورنہ ایسا جو بنایا ــــ نہ بنایا ہوتا
نشہ عشق کا شوق دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دل کو میرے حسن و تجمانہ بنایا ہوتا
اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا
کیوں خرد مند بنایا؟ نہ بنایا ہوتا!

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

جواب جنّت کا نمونہ بنا ہوا ہے جہنم کدہ بن جائے گا، نہیں اس طرح میں جمیلہ کو لینا نہیں چاہتا، یہ بھی تو نہیں معلوم، خود جمیلہ کا دل کدھر ہے؟ لیکن یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ شریف لڑکی کا دل اسی طرف ہوجاتا ہے، جدھر ماں باپ کی مرضی ہوتی ہے؟ ضرور اسے بھی اپنی منگنی کا علم ہوگا، اور وہ اب تراب علی کے سوا کسی اور کی گنجائش اپنے دل میں نکال ہی نہیں سکتی، !

وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جمیلہ کھانا لے کر آگئی، اس نے جلدی جلدی دستر خوان بچھایا، کھانا چُنا، اور اپنائیت بھرے لہجہ میں گویا شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"آج بڑی دیر کردی آپ نے ؟"

بخت خاں (افسردگی کے ساتھ) ہاں آج دیر ہوگئی، !

جمیلہ۔ بھوک تو بہت لگ رہی ہوگی۔ کھایئے، دیکھئے، یہ دوپیازہ میں نے صرف آپکے لئے پکایا ہے ہمّت مُنہ تکتا رہ گیا لیکن میں نے اسے بھی نہیں دیا۔

بخت خاں۔ اتنا ظلم نہ کیا کرو جمیلہ، آؤ ہمت ہم تم کھائیں۔

ہمت علی نے جواب دیا: "شکریہ، آپ نوش جان کریں"

بخت خاں۔ یہ کیا کھاتے کیوں نہیں؟

ہمت علی۔ میں تو باجی کے ساتھ کھاؤں گا۔

بخت خاں۔ کیا انہوں نے اب تک نہیں کھایا؟ اتنی دیر تو ہوگئی، !

ہمت علی۔ رات بھی ہوجاتی تو نہ کھاتیں، یہ ان کا اصول ہے کہ جب تک آپ کھالیں، نہیں کھائیں گی، یاد ہوگا کئی دن ہوئے، ایک دفعہ آپ سرے سے آئے نہیں تھے۔

بخت خاں۔ ہاں خوب یاد ہے، شہزادہ جواں بخت کی سال گرہ کے اہتمام لگا ہوا تھا۔

انکشاف

واقعی آج کل بخت خاں بہت پریشان تھا، نہ گھر میں سکون حاصل تھا، نہ قلعہ میں ؛ اس کی اب تک کی ساری زندگی بے فکری میں گزری تھی، لیکن اب حالت یہ تھی، کہ سکون کا ایک لمحہ بھی میسّر نہ تھا، ایک طرف جمیلہ تھی، جو اسکے حرماں نصیب دل کے لئے درد لا دوا بنتی جارہی تھی، وہ بڑی بھولی اور نادان لڑکی تھی، نہیں جانتی تھی محبت کیا ہوتی ہے، محبت کسے کہتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود بخت خاں سے محبت کرتی تھی، بخت خاں بھی اسے جان و دل سے چاہنے لگا تھا، لیکن دل کا چور زبان تک لانے کی ہمّت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا، ایک مرتبہ شروع شروع میں قدسیہ بیگم نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ جمیلہ کی منگنی تراب علی خاں سے ہوچکی ہے، وہ اپنے دل ملامت کرتا کہ جمیلہ سے محبت کیوں کرتا ہے، وہ لڑکی کو کیوں چاہتا ہے جو اسے مل نہیں سکتی جو کسی اور کی ہو جانے والی ہے، لیکن دل سے مجبور تھا، جمیلہ کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کئی بار جی میں آیا کہ ماں کو اپنی حالت لکھے، وہ چند روز کے لئے دِلّی آجائیں، اور دلاور علی خاں سے جمیلہ کو مانگ لیں ان کی بات وہ ہرگز ردّ نہیں کرسکتے۔

پھر وہ سوچتا، اس طرح چچا اور چچی میں ایک خلیج پیدا ہوجائے گی، یہ گھر

میں جانتی ہوں آپ کا جو مطلب تھا میں تو ہمت سے یہ کہہ رہی تھی کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے لیکن وہ سنتا کب ہے کسی کی،!

تراب علی جمیلہ کی ان باتوں سے بہت جز بز ہوئے، منہ پھلا کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر بعد پوچھا، خالہ جان کہاں ہیں؟ ہمت نے دوسرے کمرہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھے چلے گئے قدسیہ بیگم کے کمرہ کی طرف ہمت علی نے کہا، باجی تم نے خفا کر دیا تراب میاں کو، وہ بولی خفا ہو گئے تو کیا کریں گے، میں نہیں، ڈرتی کسی سے، یہ عزت ہے، اماں سہیں تو سہیں میں کیوں سہنے لگی؟ بخت خاں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا جمیلہ، آج تم کچھ غصہ میں معلوم ہوتی ہو ہمت پھر بول پڑا، بھوک کے ساتھ ساتھ غصہ بھی بڑھتا رہتا ہے جمیلہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا، اور بولی، کیوں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، تجھے بھوک لگی ہو، تو بیٹھ جا ان کے ساتھ، وہ کہنے لگا، وہ، یہ تو بیر میں تو تمہارے سوا بادشاہ سلامت کے ساتھ بھی نہ کھاؤں۔

بخت خاں، اور جمیلہ دونوں کو ہمت کی اس بات پر ہنسی آگئی

کھانا کھا کر، بخت خاں نے باہر جانے کے لئے لباس بدلا، اتنے میں جمیلہ پان بنا کر لا چکی تھی، پوچھا۔

"پھر کہیں جا رہے ہیں آپ؟"

بخت خاں نے پگڑی سر پر ٹھیک سے رکھتے ہوئے کہا،

"ہاں جمیلہ، قلعہ جا رہا ہوں، شہزادے صاحب نے اس وقت بلایا تھا،!"

جب بخت خاں جانے لگا تو جمیلہ نے پوچھا۔

"ہاں شام کو، کسی چیز کو جی چاہتا ہو تو بناویں، پکا دوں گی،!"

بخت نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور جواب دیا۔

ہمّت علی۔ جی اس روز کا واقعہ ہے کہ باجی نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا، بس بار بار یہ پوچھ لیتی تھیں آپ آئے یا نہیں، !

بخت خاں بڑی حیرت اور استعجاب کے عالم میں، ساتھ ہی ساتھ خوشی اور مسرت کے ساتھ یہ انکشاف سُن رہا تھا، اس کا دل و فورِ شادمانی سے اچھل رہا تھا، آج کتنا بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا اس کے دل سے، اسے یقین ہوگیا، جمیلہ کے دل میں میری جگہ ہے، اتنے میں تراب علی خاں آتے دکھائی دیئے۔

ہمّت علی نے شرارت بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور کہا۔

" باجی دیکھو وہ آرہے ہیں!"

جمیلہ۔ آج اگر تونے کوئی شرارت کی بات کہی تو وہ پیٹے بغیر نہیں رہیں گے !

بخت خاں نے تراب علی کا بڑا پرتپاک استقبال کیا، یہ حضرت اس کے اخلاق کو طنز سمجھے تیوریاں چڑھالیں، بخت نے کہا، آیئے کھانا کھایئے، انہوں نے فرمایا، الحمد للہ بھوکا نہیں ہوں، بخت نے چھیڑا اچھا پانی پی لیں، انہوں نے مُنہ بنا کر کہا، "پینے" کی عادت خدا کا شکر ہے کہ نہیں رکھتا، بخت خاں نے یہ چٹکی سہہ لی اور کہا، اچھا باتیں کریں، کچھ، وہ بولے، گو شہر میں گلی گلی کوچے کوچے پھرتے ہیں بلائیں کسی کو، ہمّت علی بیچ میں بول پڑا، اس دن تو آپ ہمیں داستان امیر حمزہ سُنا رہے تھے، تراب میاں نے جل کر کہا، چُپ رہو بدتمیز کہیں کے جمیلہ کے ماتھے پر بل آ گئے، وہ ہمّت کو مخاطب کر کے بولی، بڑے بے غیرت ہو، لاکھ مرتبہ کہدیا، چُپ رہا کرو، نہ بولا کرو ہر کسی سے، جمیلہ کے ان الفاظ نے تیر و نشتر کا کام کیا، پہلو بدل کر فرمایا،

" نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا"

وہ ذرا برہمی کے ساتھ گویا ہوئی۔

تازیانہ!

بہادر شاہ ظفر کے اشعار گلی گلی، کوچہ کوچہ گائے جانے لگے، دل سے نکلی ہوئی بات دل میں بیٹھ گئی، ہندو ہوں، یا مسلمان، ریزیڈنسی کے ملازم ہوں، یا قلعہ کے خیر خواہ، بادشاہ کے دعاگو اور ثنا خواں ہوں یا انقلاب وتغیر کے علمبردار، سب ہی تڑپ اُٹھے جیسے اچانک کسی نے پر تازیانہ لگا دیا ہو مسجدوں میں یہ اشعار زیر بحث تھے، خانقاہوں میں ان کا چرچا تھا، مدرسوں اور مکتبوں میں ترنم سے گائے جاتے تھے، محفلوں، اور صحبتوں میں ان پر تبصرے ہوتے تھے، یہ مدھم سی آواز لال قلعہ کے ایک گوشہ سے نکلی، لیکن سننے والوں کے دل ہل گئے، آنکھیں بھر آئیں خیالات میں ہلچل پیدا ہوگئی، کوئی نہ تھا کہ یہ اشعار سنتا ہو، اور اس کا خون جوش نہ کھانے لگتا ہو پڑھے لکھے لوگ تو پھر اونچ نیچ سوچتے تھے، لیکن ان پڑھ اور اکھڑ لوگ تو جان دینے پر تل گئے تھے، ہر جگہ پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"اب کیا ہوگا؟"

"انگریز یہاں سے کس طرح نکلیں گے؟"

"بہادر شاہ پورے اختیارات کے ساتھ کب بادشاہ بنیں گے؟"

جو رعائیں اور سہولتیں بہادر شاہ کو دے رکھی تھیں، انگریز ایک ایک کر کے چھین رہے تھے، وہ اپنی حکومت کا رعب سب کے دل پر قائم رکھنا چاہتے تھے وہ

جمیلہ تم کتنی تکلیف کرتی ہو میرے لئے، جو کچھ بھی پکاؤ گی بڑے شوق سے کھا لوں گا،،!

ہمّت علی۔ لیکن خدا کے لئے کریلے پکانے نہ بیٹھ جانا، اتنی نفرت ہے مجھے کریلوں سے کہ کیا کہوں ؟

جمیلہ۔ تجھے کیا معلوم میں کیا پکاؤں گی ؟

ہمّت علی۔ اتنا بے وقوف نہیں، تم ضرور کریلے پکاؤ گی۔ اس لئے کہ بخت بھائی پسند کرتے ہیں،!

جمیلہ کچھ شرما سی گئی، اس نے ہمّت کی پیٹھ پر ایک دھپ لگاتے ہوئے کہا، اب تو یہاں سے جائے گا یا نہیں، ——— چل کھانا کھائیں ——— ،!''

اس نوک جھونک کے بعد دونوں بھائی کہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے،

ادھر بخت خان ہوا کے گھوڑے پر سوار لال قلعہ کی طرف جا رہا تھا، !

آج وہ بہت خوش تھا،

وہ جمیلہ اگر چاہتا تھا، اس سے محبّت کرتا تھا لیکن ایک بات تھی جو کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہتی تھی، اور وہ تھی تراب علی کی ذات، اس نے سمجھ لیا تھا، یہ ایسا کانٹا ہے جو دُور نہیں ہو سکتا، لیکن آج کی باتوں سے کئی باتیں صاف ہو گئیں، یہ کہ جمیلہ تراب علی کو ذرا بھی نہیں چاہتی، یہ کہ اس کے دل میں میری جگہ ہے!

یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اب ساری زندگی میں جمیلہ کی یاد میں بسر کر سکتا ہوں۔

یہ انگریز سوداگر بن کر آئے تھے، رفتہ رفتہ حاکم بنے، اور ایسے بنے، کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتے، اور بعض لوگ جو ذرا زیادہ وسیع نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرتے، وہ سوچتے تھے، سوال بہادر شاہ کی ذات کا نہیں، خاندان مغلیہ کا بھی نہیں ہے، سوال جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کا ہے، کم و بیش ایک ہزار سال تک انہوں نے اس ملک پر حکومت کی، کیا واقعی اب مسلم حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا ہے؟ کیا مسلمانوں کی سطوت اور شوکت کے خاتمہ کا وقت قریب آ گیا ہے؟ خطا اگر ہے تو خاندان مغلیہ کے ملوک و سلاطین کی، لیکن کیا سزا بے گناہ مسلمانوں کو ملے گی؟

آج جوان بخت بھی اپنے محل کے ایک گوشہ میں بیٹھا یہی کچھ سوچ رہا تھا، دفعتہ وہ اُٹھا اور مرزا قویاش کی محلسرا کی طرف روانہ ہو گیا، بخت خاں سایہ کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا،

ادھر مرزا قویاش کی دولت سرا کا منظر اس وقت قابل دید تھا، وہ ایک شاندار اور وسیع کمرہ میں، تشریف فرما تھے، سارے کمرہ میں دری کا فرش تھا، اس پر دودھ کی طرح سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور وسط میں ایک نہایت مرصع، اور گراں قیمت قالین تھا، اس پر ایک زرکار مسند تھی مسند پر ایک ریشمی گاؤ تکیہ تھا، دروازوں پر چق کی ٹٹیاں لگی تھیں، فرشی پنکھا چل رہا تھا، جھبو خاں مرتضیٰ علی بیگ اور دوسرے مصاحب حاضر تھے، کسی طوائف زادی کے ذکر سے محفل گرم ہو رہی تھی، اس کے ناز و انداز عشوہ و غمزہ، اور حسن بے مثال پر لچھے دار تقریریں جاری تھیں، کہ دفعتاً جوان بخت اپنے ہمزاد بخت خاں کے ساتھ داخل ہوا، اسے دیکھ کر جھبو خاں، اور مرتضیٰ علی بیگ کی سٹی گم ہو گئی، دونوں سرو قد کھڑے ہو کر آداب و تسلیمات بجا لائے۔ جوان بخت نے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا، اور بھائی کے پاس جا کر مسند پر بیٹھ گیا، اسے دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں مرتضیٰ علی بیگ اور جھبو خاں نے، مرزا قویاش

گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان کی حکومت کو چیلنج کریں، ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ تعصب اور خود غرضی کے باعث انگریزوں کو پسند کر رہا تھا، ان سے میل جول بڑھا رہا تھا بعض ہندوؤں نے تو عیسائی مذہب بھی اختیار کر لیا تھا[1] اگرچہ ان کے نام، ان کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج ہندوانہ تھے، عیسائی بن کر انہوں نے ترقی اور عروج کی مشکلیں آسان کر لی تھیں لیکن ہندو عوام اب تک انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ دلّی شہر میں، جو بادشاہ موجود ہے اور پشت ہا پشت سے جو خاندان حکومت کرتا آ رہا ہے اسے بے خطا بے قصور چھوڑ کر ایک عورت[2] کو، جو سات سمندر پار کی رہنے والی ہے، اور وہیں رہتی ہے، کیونکر اپنا بادشاہ مان لیا جائے؟ وہ آپس میں جب بھی باتیں کرتے انگریزوں کا مذاق اڑاتے انہیں گالیاں دیتے، انہیں نکال باہر کر دینے کی تدبیریں سوچا کرتے،

غرض ہندو ہوں یا مسلمان، سب انگریزوں سے بیزار اور متنفر ہو رہے تھے، انگریزوں کی ہر پیشقدمی اور کامیابی ان کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا کرنے لگتی تھی۔

آج پُونہ کی ہندو حکومت ختم ہوئی، کل اودھ کی مسلم حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، سراج الدولہ مسلمان تھا لیکن ناگپور کا بھونسلے راجہ تو ہندو تھا، دونوں کو ختم کر دیا، آج یہ ریاست ہڑپ کر لی، کل اس ریاست پر قبضہ کر لیا، آج اس رجواڑے کا الحاق کر لیا، کل اس ریاست کو اپنی حفاظت میں لے لیا، بس یہی پالیسی تھی انگریزوں کی۔ اور اس پالیسی نے عوام کو، انگریزوں سے برگشتہ اور بیزار کر دیا تھا، پھر بہادر شاہ کی بے بسی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ہندوستان میں ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا، ہمارا بادشاہ کس کرب اور دُکھ میں زندگی بسر کر رہا ہے،

---

[1] اور بڑے مناسب سفائرس گئے تھے۔ [2] ملکہ وکٹوریہ۔

پسرِ نوُح!

مصاحبوں کے جانے کے بعد مرزا قوباش نے، جوان بخت پر ایک استفہامی نظر ڈالی۔ سمجھ نہ سکے، بے وقت آنے کا سبب کیا ہے،؟

مرزا قوباش۔ اس دوپہر میں تم نے کیوں زحمت کی؟ کوئی خاص بات ہے،؟

جوان بخت۔ جی، ایک ضروری بات عرض کرنی تھی، اگر آپ بُرا نہ مانیں اور اجازت دیں تو عرض کروں۔!

مرزا قوباش۔ سب کچھ کہنے کی اجازت ہے، جو کہنا چاہتے ہو ضرور کہو، لیکن اس انداز سے کہ الفاظ بدنمانہ ہوں، بُرا نہ لگے،!

جواں بخت۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہے، جہاں پناہ نے مجھ کو ولی عہد منتخب کیا تھا،!

مرزا قوباش۔ اور تمہیں بھی یہ معلوم ہو گا کہ وائسرائے اور ریزیڈنٹ بہادر ہی ولی عہدی تسلیم کر چکے ہیں!

جواں بخت۔ جی ہاں، بہت اچھی طرح، خدا آپ کو یہ منصب مبارک کرے،!

مرزا قوباش۔ ہمیں تم سے ہمدردی ہے، لیکن حق ہمارا تھا۔ ہمیں ملا،!

جواں بخت۔ مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے۔ میں نے جو مبارکباد دی تھی۔ وہ طنز نہ تھا، میرے دل کی آواز تھی بالکل مخلصانہ،!

سے اذن رخصت طلب کیا، پھر آداب و تسلیمات کی رسم کرا در سر جھکا جھکا کر
ادا کی، اور چلے گئے ؛

صحیح نہیں ہے ،میری ولی عہدی کا اب سؤال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یہ جو آپ
آپ فرمایا کہ کسی پابندی کے ساتھ آپ تخت حکومت نہیں قبول کر سکتے سچ
عرض کرتا ہوں ،آپ کے ان الفاظ نے میرے دل کو خوشی سے بھر دیا تیموری
نسل کے ایک شہزادے کو یہی بات کہنی چاہیئے تھی لیکن گستاخی معاف ایک
بات عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مرزا قویاش ۔ضرور کہو!

جواں بخت ۔پھر آپ نے ذلت بخش شرائط کے ساتھ ولی عہدی کیسے قبول کرلی؟

مرزا قویاش ۔اپنی مصلحت ہم خوب سمجھتے ہیں ،تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے ،ہاں تو
وہ شرط کیا ہے؟

جواں بخت ۔شرط یہ ہے کہ آپ صحیح معنی میں بادشاہ بننے کا عزم کرلیں!

مرزا قویاش ۔ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے!

جواں بخت ۔جہاں پناہ بوڑھے ہو چکے ہیں ،اب ان کی امنگ ختم ہو گئی ،حوصلہ
سرد پڑ گیا ،دنیا سے ان کا دل سیر ہو چکا ہے ۔اہل دُنیا سے وہ بیزار ہو چکے ہیں ،
اب نہ انہیں تاج وتخت کی ہوس ہے ،نہ حکمرانی اور شہریاری کا شوق! لہٰذا
تیموری تخت پر ایک ایسے نوجوان کی ضرورت ہے ،جس کا دل حوصلوں سے
معمور ہو جو اپنے اجداد کی میراث کا سچا وارث ہو ،جو دوستوں کی قدر کر سکے ،
اور دشمنوں سے لڑ سکے ،جو غاصبوں کی مشّھی مروڑ سکے اور اپنی چھینی ہوئی
دولت واپس لے سکے جس کے حدود سلطنت صرف لال قلعہ تک محدود نہ
ہوں ،کم از کم یہ سرحدیں پھر اتنی وسیع ہو جائیں ،جتنی اورنگ زیب عالمگیر
کے عہد میں تھیں ،ظاہر ہے یہ کام اس بڑھاپے میں جہاں پناہ نہیں کر سکتے ،
لہٰذا وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر عبادت کریں گے اور دنیا اور نگ نشین ان کا موں

مرزا قویاش۔ کیا تم صرف مبارکباد دینے آئے تھے!

جواں بخت۔ نہیں ـــــ یہ عرض کرنے آیا تھا کہ میں نے جہاں پناہ کو آمادہ کر کیا ہے کہ وہ آپ کے حق میں تخت و تاج سے دستبردار ہو جائیں۔

مرزا قویاش۔ تمہاری گفتگو کو سنجیدگی کے حدود سے باہر نہ ہونا چاہیئے، مذاق کرنے کے لئے قلعہ میں اور بھی بہت سے لوگ ہیں، !

جواں بخت۔ برادرِ معظم! میں غلط نہیں عرض کرتا، واقعی میں نے انہیں آمادہ کر لیا ہے، اور وہ اس بات پر تیار ہیں کہ آپ کا جشن تخت نشینی دھوم دھام سے منائیں، اپنے ہاتھ سے آپ کے سر پر تاجِ شہریاری رکھیں اس موقع پر تمام شہزادے آپ کے سامنے حلف وفاداری اُٹھائیں گے، آپکے دستِ مبارک پر اطاعت کی بیعت کریں گے، اور اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو جائیں گے۔ وہ صرف اتنا لیں گے جو آپ دیں، وہ صرف اسی کو حق مانیں کے جسے آپ تسلیم کریں، بحث، مباحثہ، تلخی، بدمزگی، نزاع اور سازش ختم ہو جائیں گی!

مرزا قویاش لیکن سمجھ میں نہیں آتا، اس غیر معمولی نوازش کا ہدف ہمیں کیوں بنایا جا رہا ہے، یہ بھی تو بتاؤ، اس گرم گستری، اس اعتماد اس سپردگی کا مقصد مدعا کیا ہے، ضرور کوئی خاص بات ہے!

جواں بخت۔ جی ہاں خاص بات تو ہے بلکہ خاص شرط!

مرزا قویاش۔ شرط؟ ـــــ ہاں شرط بھی ہونی چاہیئے اور میں بتادوں وہ شرط کیا ہے، یہ کہ ہم تمہیں اپنا ولی عہد بنالیں، داد نہ دو گے اس فراست کی، لیکن یہ شرط ہمیں منظور نہیں ہم کسی پابندی کے ساتھ تختِ حکومت نہیں قبول کر سکتے، !

جواں بخت۔ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت ہو کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ تم سوجھ بوجھ رکھتے ہو، معاملات کو سمجھتے ہو، حالات کا تجزیہ بھی کر لیتے ہو لیکن نہ یوں کہ دوسرے آنکھ بند کر کے تمہاری ہر بات مان لیں۔ جواں بخت تم بہت کچھ سہی لیکن ابھی بچے ہو، ہماری گود کے کھلائے اگر واقعی تمہارا یہ مشورہ مخلصانہ ہے تو ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جہاں پناہ نے خود اس اسکیم پر عمل کیوں نہیں کیا؟

جواں بخت۔ آپ بہت برہم ہیں، میں کیا عرض کروں جو کچھ کہوں گا، اس کا مطلب برعکس لیا جائے گا، !

مرزا قوباش۔ بدگمانی سے کام نہ لو، ہر بات کا ہم وہی مطلب سمجھتے ہیں، جو واقعتہً ہوتا ہے، ——!

جواں بخت۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ جہاں پناہ دنیا سے، اور اہلِ دنیا سے بیزار ہو چکے ہیں، ان کا دل بجھ چکا ہے، ان میں کوئی ولولہ باقی نہیں رہ گیا ہے، اس لئے ہنسی خوشی آپ کے حق میں تخت دستبردار ہونے کو تیار ہیں۔

مرزا قوباش۔ نہیں —— اصل بات یہ ہے کہ جہاں پناہ تمہیں بادشاہ بنانا چاہتے ہیں لیکن ہمارا شکار کر کے ہمیں بھینٹ چڑھا کے، ؟

جواں بخت۔ وہ کیونکر صاحب عالم؟

مرزا قوباش۔ بادشاہ سلامت ہمارے حق میں دستبردار ہو جائیں گے، تم سب ہماری بادشاہت تسلیم کر لو گے، ہم بادشاہ ہو کر انگریزوں سے لڑیں گے، ضرور ہاریں گے بھلا ہمارا اور ان کا مقابلہ کیا، ہارنے کے بعد میدانِ جنگ میں مرنا یقینی ہے بچ بھی گئے تو کالا ہے کہ ہمیں جیتا چھوڑیں گے، بادشاہ سلامت پھر میدان میں آئیں گے، انگریزوں سے کہیں گے، نالائق تھا مرزا قوباش، جیسا کیا ویسا بھگتا، اچھا ہوا مارا گیا،

کو سرانجام دے گا، کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟

مرزا قوباش۔ جس کسی نے بھی یہ نقشہ بنایا ہے، ہم اس کی ذہانت کی داد دیتے ہیں، ہم سے انتقام لینے کی، ہماری جان لینے کی اس سے خوبصورت اسکیم اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی، !

جواں بخت۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں! ہم میں سے کوئی آپ کا دشمن نہیں، مخالف نہیں بدخواہ نہیں، آخر کس کے بارے میں آپ کو یہ غلط فہمی ہے؟

مرزا قوباش۔ یہ غلط فہمی نہیں، دُور بینی ہے۔ تم لوگ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو، اسے ہماری آنکھ نے دیکھ لیا۔ ہمارے دماغ نے سمجھ لیا، ہمارے دل نے محسوس کر لیا۔

جواں بخت۔ لیکن برادرِ معظم ——

مرزا قوباش۔ خاموش —— یہاں تمہاری دال نہیں گل سکتی ہم اپنے محضر قتل پر دستخط نہیں کر سکتے، ہم بیوقوف نہیں بن سکتے، ہم کسی کے حتیٰ کہ جہاں پناہ کے بھی آلہ کار نہیں بن سکتے، —— کیا تمہارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم انگریزوں سے بگاڑ لیں؟

جواں بخت۔ بغیر انگریزوں سے بگاڑے ہم بن نہیں سکتے، دُنیا کی یہی ریت ہے، ایک بنتا ہے، ایک بگڑتا ہے، ایک چراغ بجھتا ہے دوسرا جلتا ہے، ایک پھول مرجھاتا ہے۔ دوسرا کھل اٹھتا ہے، تعمیر بغیر تخریب کے نہیں ہو سکتی ہمیں مٹا کر انگریز بنے ہیں۔ انہیں مٹا کر ہم بن سکیں گے، اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے صاحب عالم!

مرزا قوباش۔ ہم جانتے ہیں، تم زیرک ہو لیکن نہ اس قدر کہ ہمیں بے وقوف بنا سکو، ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ تم ذہین ہو لیکن نہ اس درجہ کو ہمیں دھوکہ دے سکو

اب میرے فرزند ارجمند وسعادت مند، جوان بخت کو تخت نشین کر دیجئے ،

انہیں یہ بات ماننی پڑے گی، (ہنسکر)

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی ؟

لیکن ہم کچی گولیاں نہیں کھیلے ہیں، بازی نظر میں ہے، ہم ایسی چال نہیں چلیں گے کہ بات کھانے کا اندیشہ ہو!

جواں بخت ۔صاحب عالم آپ جو چاہئیں، لیکن ہم میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا جو آپ فرما رہے ہیں۔ سچ سچ بتا دوں اس فیصلہ سے جہاں پناہ کا اصلی مقصد کیا ہے ؟

مرزا قویاش۔ وہ کیا؟ کہہ ڈالو وہ بھی،

جواں بخت۔ جہاں پناہ کو معلوم ہؤا ہے کہ انگریزوں نے اس شرط پر آپ کو ولی عہد تسلیم کیا ہے، کہ آپ جہاں پناہ کے بعد بادشاہ کا لقب اختیار نہ کریں، لال قلعہ کی سکونت ترک کر دیں، اور صرف پندرہ ہزار ماہوار گزارہ لیں، !

مرزا قویاش۔ اچھا پھر ——— !

جواں بخت۔ جہاں پناہ کا خیال ہے کہ ان کی زندگی میں آپ عملی طور پر ان کے جانشین بن گئے، تو اُس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد انگریز، ہرگز یہ جرات نہیں کریں گے کہ آپ کو تخت سے اُتاریں، یا آپ کا ماہانہ کم کریں، یا آپ کو لال قلعہ کی سکونت ترک کر دینے پر مجبور کر دیں، لہٰذا بادشاہت پر آپ کا حق ثابت ہو جائے گا۔

مرزا قویاش۔ لیکن ہماری سمجھ میں ایک بات کسی طرح نہیں آتی، آخر جہاں پناہ، اس گنہگار قدیم، اور عاصی پُر معاشی پر دفعتہً ابرِ رحمت کی طرح کیوں برسنے لگے یا تو یہ بھی کی کیفیت تھی کہ ہمارا حق مار کر تمہیں خلعت ولی عہدی پہنا دیا، یا،

محبّت پدری کا سمندر لہریں مارنے لگا، اور ولی عہدی تو کیا، بادشاہت تک دینے پر تیار ہو گئے، !

جواں بخت ۔ انہوں نے اپنی غلطی محسوس کر لی، وہ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ نہیں چاہتے کہ خاندانی منافرت اور تنازعات اتنے بڑھ جائیں کہ خاندان تیموری کا خاتمہ ہو جائے، دشمن اس سے فائدہ اٹھائیں، اس فیصلہ میں جہاں آپ کی محبت کام کر رہی ہے۔ وہاں خاندان کے وقار و عظمت کا سوال بھی ہے، اور ان باتوں کا احساس جہاں پناہ سے زیادہ اس خاندان میں اور کون کر سکتا ہے۔

مرزا قویاش ممکن ہے تمہارا خیال صحیح ہو، لیکن ہم وقت سے پہلے بادشاہ نہیں بننا چاہتے، ہمارا جواب جہاں پناہ تک پہنچا دو۔!

جواں بخت ۔صاحب عالم آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ آپ جہاں پناہ کی پیش کش کو مسترد کرتے ہیں ؟ کیا یہ پیش کش اس سے زیادہ نہیں ہے، جو انگریز آپ کو دے رہے ہیں !

مرزا قویاش ممکن ہے ہو ـــــ لیکن ہمارا عمل تو نو نقد نہ تیرہ ادھار کے مقولہ پر ہے، ـــــ آج اگر ہم جہاں پناہ کی پیش کش منظور کر لیں، تاج شہر یاری سر پر رکھیں، اور تختِ حکومت پر بیٹھ جائیں۔ تو اس میں بہت سے جھمیلے ہیں۔

جواں بخت ۔ مثلاً ـــــ ؟

مرزا قویاش ۔مثلاً انگریزوں سے جنگ، ہم صلح پسند آدمی ہیں، جنگ سے ہمیں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔اس پیش کش کے قبول کر لینے میں بہت سے خطرے ہیں، بلاکتوں اور تباہیوں کے اندیشے ہیں، لیکن اگر ہم اس پیش کش کو مسترد کر دیں، انگریزوں کے وعدوں پر بھروسہ کریں تو پھر کسی نہ کسی دن تاج شہریاری اور تختِ حکومت

اتمامِ حجّت

راستہ بھر، جواں بخت نے، اپنے رفیق و ندیم، بخت خاں سے کوئی گفتگو نہیں کی، اس کا چہرہ تمتمایا ہُوا تھا، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، بخت خاں، یہ کیفیت دیکھ رہا تھا، اور خاموش تھا، وہ اپنے آقا کے اضطراب اور خلجان کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا، قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد، جواں بخت نے بخت خاں سے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا، ہماری بدبختی کا عالم؟ بتاؤ، اب کیا کیا جائے؟

بخت خاں۔ غلام کیا عرض کر سکتا ہے صاحبِ عالم، —— ؟ واقعی اس سے بڑھ کر افسوس ناک بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ جہاں پناہ کے اخلاص اور آپ کی بے نفسی کو یوں ٹھکرا دیا جائے، بات یہ ہے، کہ مرزا قویاش، باپ اور بھائی سے بہت زیادہ بدظن ہو چکے ہیں۔

جواں بخت۔ انہیں صرف انگریزوں پر اعتماد ہے، وہ دشمن پر بھروسہ کرتے ہیں، دوستوں پر نہیں۔

بخت خاں۔ بدقسمتی کی انتہا ہے یہ استغفراللہ۔

جواں بخت۔ بخت، ہم تم پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں ——

بخت خاں۔ غلام کو اس پر فخر ہے، اور یہ فخر زندگی کی آخری سانس تک میرا، رفیق رہے گا۔

ہمارے قبضہ میں آ ہی جائے گا ۔!

جواں بخت۔ کیا آپ کو یقین ہے۔ انگریز اس معاہدہ کو ردّی کاغذ کی طرح پھاڑ کر پھینک دیں گے جو آپ کر چکے ہیں، اور جس کے روسے نہ آپ کو بادشاہ کا لقب استعمال کرنے کا حق ہے۔ نہ لال قلعہ میں سکونت اختیار کئے رہنے کا۔!

مرزا قویاش۔ ہاں ـــــ وہ معاہدہ صرف برائے بیت ہے، اس لئے نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے۔

جواں بخت۔ آخر اس حُسنِ ظن کا سبب ؟

مرزا قویاش۔ یہ سوال تم اس طرح کر رہے ہو، جیسے اپنے افعال اور اعمال کے ہم تمہارے سامنے جواب دہ ہیں، حالانکہ یہ حق جہاں پناہ بھی نہیں رکھتے ۔!

جواں بخت۔ نہیں صاحب عالم میں آپ کا ایک حقیر خادم ہوں میری یہ جرأت اور ہمّت کہاں! میں نے تو صرف ایک سادہ سی بات دریافت کی تھی ۔!

مرزا قویاش۔ لیکن یہ سادگی تھی، جو پرکاری سے بھری ہوئی تھی، !خیرـــ تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں انگریزوں پر اعتماد ہے۔!

جواں بخت۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میرا کچھ عرض کرنا قطعاً بیکار ہے، خادم کو واپس جانے کی اجازت مرحمت ہو!

مرزا قویاش۔ شوق سے جا سکتے ہو۔!

جواں بخت نے بھائی کو ادب کے ساتھ سلام کیا اور پھر اپنی حویلی میں آگیا، اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں ۔!

مرشد زادوں کی دل شکن اور رسوا کن حرکتیں، ان سب باتوں نے انہیں بہت زیادہ دل برداشتہ کر دیا ہے۔ وہ بالکل مایوس ہو چکے ہیں بعض وقت تو ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، انہیں دیکھ کر۔

بخت خاں لیکن صاحب عالم، ایک بات یاد رکھیئے، جہاں پناہ کی سرپرستی اور تائید کے بغیر، ہماری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی عملی حیثیت سے ان کی بادشاہت صرف قلعہ کے اندر محدود ہے لیکن ہندوستان بھر میں انہیں عقیدت اور عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر ہماری سرگرمیاں بادشاہ سلامت کی تائید وحمایت کے بغیر شروع ہوئیں، تو وہ آسانی سے کچل دی جائیں گی، اور ہندوستان پر مجموعی حیثیت سے کوئی اچھا اثر بھی نہیں پڑے گا، اس کے برعکس اگر بادشاہ سلامت کی سرپرستی حاصل رہی تو اس سرے سے لے کر اُس سرے تک آگ لگ جائے گی۔

جواں بخت: بہرحال اس مرحلہ کو بھی کسی نہ کسی طرح طے کر ہی لیا جائے گا۔

بخت خاں جی ہاں، یہ بہت ضروری ہے اس روز آپ نے فرمایا تھا ملکۂ عالم نواب زینت محل انہیں ہموار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس کا کچھ نتیجہ نکلا؟

جواں بخت۔ ابھی نہیں، لیکن انشا اللہ ضرور اچھا نتیجہ نکلے گا، ہماری نیت نیک ہے غرض مندی کے دھبّے سے ہمارا دامن صاف ہے۔ ہم بادشاہت نہیں چاہتے۔ اقتدار و اختیار نہیں چاہتے، صرف یہ چاہتے ہیں انگریز یہاں سے نکل جائیں، ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھیں۔ جو بھی آگے بڑھے، ہم اس کا ساتھ دینے، اور اس کی ماتحتی میں کام کرنے کو تیار ہیں، جہاں پناہ تو یہاں تک فرما رہے تھے، ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ ہند و والیان ریاست اپنی ایک مجلس بنالیں، اور وہ مجلس لال قلعہ

جواں بخت - ہاں ٹھیک ہے، اور تم جانتے ہو اس اعتماد کے باوجود ہم نے تمہاری تجویز جھٹکا دی گئی۔ تمہاری رائے تھی، ہم ہمت سے کام لیں۔ جہاں پناہ میں ولولہ اور حوصلہ پیدا کریں، عوام میں آزادی وطن کا جذبہ پروان چڑھائیں، خاص کر ان کے مستقبل کا واسطہ دیں، اپنے چیدہ چیدہ جاں نثاروں اور فدا کاروں کی ایک فوج مرتب کریں، اور تن بہ تقدیر، میدان عمل میں اتر آئیں جو ٹکرے اس سے مقابلہ کریں، خواہ وہ انگریز ہوں، یا ہندو، مسلمان، بالائی قلعہ کے شہزادے۔

بخت خاں - بے شک غلام کی یہی رائے تھی، اور وہ اب بھی اپنی رائے پر پورے اصرار کے ساتھ قائم ہے۔

جواں بخت - ہم محسوس کرتے ہیں تمہاری رائے معقول ہے۔

بخت خاں - صاحب عالم یہ رائے نہیں، چارۂ کار ہے۔ آج کی گفتگو سے، جو آپ نے صاحب عالم مرزا قویاش بہادر فرمائی، اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے؟

جواں بخت - ہاں، ـــــ لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا، ہم نے اتمام حجت کر لیا، اس کے بغیر اگر کوئی قدم اٹھاتے تو ہمارا دل مطمئن نہ ہوتا ضمیر میں کھٹک رہتی، اب ہم پاک دل، صاف ضمیر، اور نیک ارادوں کے ساتھ میدان عمل میں اُتریں گے، اور اپنے آپ کو قسمت کے حوالہ کر دیں گے۔ یا تخت یا تختہ۔

بخت خاں - بے شک یہی ہونا چاہیئے۔ لیکن جہاں پناہ کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟ کیا وہ بھی ہمارا ساتھ دیں گے؟

جواں بخت - کچھ نہیں کہا جا سکتا، کچھ تقاضائے عمر، کچھ امراض کی یورش، کچھ

ہیں ادا کروں؟

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

صرف اشارہ کی دیر تھی، خدا نے چاہا، تو بہت جلد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ لاٹ صاحب اور ریزیڈنٹ صاحب، اور سارے انگریزوں کو کان پکڑ کر اپنے ملک سے نکال دیں۔

جواں بخت۔ خدا وہ دن جلد لائے، ہم اس مبارک دن کا بےچینی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے، جہاں پناہ بھی بالآخر ہمارا ساتھ دیں گے،

بخت خاں! ہم جہاں پناہ سے تمہاری بہادری، اخلاص، وفاداری، جاں نثاری اور ذہانت کا ذکر کر چکے ہیں، وہ تم سے بہت خوش ہیں، اور انشاءاللہ تمہاری کارگزاریوں کو دیکھ کر وہ اور زیادہ مسرور ہوں گے، درحقیقت انہیں ایک ایسے ہی جانباز اور جاں نثار کی ضرورت تھی، جیسے تم ہو، کاش جہاں پناہ کو تم بہت پہلے میسر آجاتے تو شاید آج حالات کچھ اور ہوتے۔

بخت خاں۔ میرے آقا اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ خدا جہاں پناہ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے، خدا آپ کو سلامت رکھے، وہ سب کچھ ہوگا۔ جو ہم چاہتے ہیں؟

سے ہندوستان پر حکومت کرے، اس صورت میں بھی ہم تخت وتاج سے
دستبردار ہوجائیں گے۔ ؎
بخت خاں۔ یہ کیا؟ یہ کیوں؟ یہ بات تو غلام کی ناقص سمجھ میں نہیں آئی، ا—
آخر جہاں پناہ تخت وتاج سے اپنے بیزار کیوں ہو گئے ہیں کہ جب دیکھئے
جب، ہر ایک کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں؟
جواں بخت۔ یہ ان کی بے نفسی ہے وہ ملک وقوم پر اپنی ذات اور اپنے خاندان
کے مفاد کو مقدم نہیں رکھتے لیکن ایک بات سے ہچکچاتے ہیں۔ اور وہ ہے
کشت وخون اور ہنگامہ آرائی، وہ قتل وغارت نہیں برداشت کر سکتے، اگر
ایسا ہوا تو ملک تباہ ہو جائے گا مسلمان مٹ جائیں گے مغل خاندان کا
نشان بھی صفحۂ ارض پر باقی نہیں رہے گا، اور ہمارا خیال ہے کہ وہ غلط نہیں
کہتے، کیوں تمہاری کیا رائے ہے؟
بخت خاں۔ غلام کا تو خیال ہے، یہ وقت سوچنے، غور کرنے، اونچ نیچ، اور
نشیب وفراز کے نکتے حل کرنے کا نہیں عمل کا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے
آپ فرما ہی چکے ہیں تخت یا تختہ، عزت کی زندگی یا آبرو کی موت دنیا میں
مردوں اور جواں مردوں کا وطیرہ ہمیشہ یہی رہا ہے۔
جواں بخت۔ ٹھیک کہتے ہو ہمیں تم سے کامل اتفاق ہے، جہاں تک ہماری ذات
کا تعلق ہے، ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم نے اپنے آپ کو تمہارے حوالہ کر دیا
تم اپنی اسکیم پر عمل کرو، اپنے جوانوں کو تیار کرو، اپنے پروگرام کا دائرہ
وسیع کرو۔
بخت خاں (خوش ہو کر) صاحب عالم اس اعتماد اور عزت افزائی کا شکریہ کن الفاظ

؎ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا اعتراف زمانۂ حال کے مؤرخین کرتے ہیں۔

آخر کئی کانفرنسوں کے بعد یہ طے ہوا کہ شہزادہ کو آلہ آباد کے قلعہ میں کچھ دنوں کے لئے تادیباً نظر بند کر دیا جائے، ماں کا دل یہ تادیبی سختی بھی نہ برداشت کر سکا، سیدھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پہنچیں، اور منت مانگی کہ اگر شہزادہ نظر بندی سے آزاد ہو گیا، تو پھولوں کی چادر مزار پر چڑھائیں گی، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بہت جلد نظر بندی کی پابندی ختم ہو گئی بس پھر کیا تھا دھوم دھوم سے چادر چڑھائی گئی اور اس جوش و خروش سے شہر کی ہندو مسلم رعایا نے حصّہ لیا ہے کہ ایک میلہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، دلّی کے منچلوں کو تو ایسے مواقع کی تاک رہتی ہے، یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیتے، اس میلہ کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور ہر سال بڑے تزک و احتشام سے میلہ ہونے لگا، جس میں ہندو مسلمان دل کھول کر حصّہ لیتے، اور سارا وقت رنگ رلیوں میں صرف کرتے، میلہ ختم ہونے کے بعد جب لوگ واپس جاتے تو دل میں یہ تمنّا لے کر، کہ خدا کرے سال جلد ختم ہو، اور میلہ کا دن وقت سے پہلے آئے۔

بہادر شاہ نے تخت نشین ہو کر اس میلہ کو اور چمکایا، انہوں نے حضرت قطب صاحب کے قرب میں ایک عنصر سا۔۔۔ لیکن شاندار اور پر شکوہ محل تعمیر کرایا[1]، اس موقعہ پر قلعہ کے شہزادوں، شہزادیوں اور بیگمات کے ساتھ وہ بہ نفس نفیس تشریف لاتے، ان کی آمد سے رونق اور چہل پہل میں مزید اضافہ ہو جاتا، اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، وہ خدم حشم سمیت دو دن پہلے سے تشریف لے آئے، اور ان کے آتے ہی یہ ویرانہ گلزار بن گیا، بادشاہ اپنی رعایا پر کچھ اس طرح شفقت کا اظہار کرتے تھے، کہ واقعی طور پر ان میں اور رعایا میں باپ اور اولاد کا رشتہ قائم ہو گیا تھا، وہ رعایا کے دُکھ درد پر کڑھتے اور رعایا ان کے رنج و صدمہ کو اپنا غم سمجھتی!

آج کا موسم بھی بڑا اچھا تھا، ـــــــ

---

[1] ۔ اس کا کچھ حصّہ اب تک موجود ہے۔

پھول والوں کا میلہ

آج پھول والوں کا میلہ تھا ـــــ یہ میلہ قطب صاحب[ؒ] میں لگتا تھا، مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ رابطہ و خلوص پیدا کرنے کی کوششیں کی تھیں، انہی میں یہ پھول والوں کا میلہ بھی تھا، اس کی تاریخ یہ ہے، کہ بہادر شاہ کے ایک بھائی مرزا جہانگیر انگریزوں سے بہت جلتے تھے، اور ان کے اثر و نفوذ کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، انگریز ریزیڈنٹ کو دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، جب وہ آتا "یہ لو لو ہے دو" کہہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے، قلعہ کی دھاک اب تک انگریزوں پر ایسی بیٹھی تھی کہ کچھ کر نہ سکتے تھے، وہ ایک بادشاہ زادے کو اپنے احترام پر مجبور نہ کر سکتے تھے، لیکن ایک مرتبہ انہیں بدلہ لینے کا موقع مل گیا، بات یہ ہوئی کہ کسی بات پر بپھر کر، انگریز ریزیڈنٹ کے انہوں نے پستول مار دیا، بس بھر گیا تھا۔ ایک شور قیامت برپا ہو گیا، لیکن اتنی مجال اب بھی نہ تھی کہ کچھ کر سکتے،

[ؒ] دلی سے چند میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ مہرولی ہے، قطب الدین ایبک کا بنایا ہوا قطب مینار یہیں ہے، لیکن مہرولی کو جو تقدس حاصل ہے، وہ قطب مینار کے باعث نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ وہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار پر انوار ہے، جہاں بڑے بڑے ملوک و سلاطین سر جھکا کر حاضر ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مہرولی کا دوسرا نام اسی مناسبت سے "قطب صاحب" بھی ہے!

انہیں دیکھ کر تمام شہزادیاں اور مرشد زادیاں سروقد تعظیم کو کھڑی ہوگئیں، امرأ اور روساے شہر کی جو صاحبزادیاں رونق افروز تھیں وہ بھی ادب سے آگے بڑھیں، اور تسلیمات و کورنش بجا لائیں۔ زینت محل نے ایک ایک کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، خیریت پوچھی، اور دو ایک بول بول کر واپس جانے لگیں۔ کہ ان کی نظر اس لڑکی پر پڑی وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں، اور محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا:۔

"کیوں بیٹی کشور آرا ہم کو سلام بھی نہ کرو گی؟"

وہ ذرا شرماتی ہوئی بولی،

"خدا نہ کرے میں ایسی گستاخی کا ارتکاب کروں، میں نے دیکھتے ہی سلام عرض کیا تھا،!"

وہ کہنے لگیں ـــــ "اچھا بیٹی میری ہی نظر چوک گئی ہوگی، گھر میں سب خیریت تو ہے،؟

پھر مسکراتے ہوئے فرمایا، تمہارے ابا ہم لوگوں سے کب تک روٹھے رہیں گے مجھے تو یہی تعجب ہے انہوں نے بھیج کیسے دیا تمہیں؟ پوچھ کر۔

زینت محل ہنسنے لگیں اور کشور آرا مسکرا کر خاموش ہوگئی، پھر اس نے کہا، "پھول والوں" کے میلے میں تو ابا جان ہمیشہ آتے ہیں، اور مجھے بھی ساتھ لاتے ہیں!"

زینت محل نے دریافت کیا۔

"تو کیا وہ بھی آئے ہیں تم انہی کے ساتھ آئی ہو؟"

کشور آرا نے جواب میں کہا:۔

"جی ہاں ابا جان تشریف لائے ہیں خود تو جہاں پناہ کی خدمت میں مجرا عرض کرنے چلے گئے اور مجھے یہاں بھیج دیا۔!"

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے گرمی کی شدت کم دی تھی محل کے باغ میں چھوٹے بڑے بچے شہزادیاں اور مرشد زادیاں ان کی خواصیں اور سہیلیاں، شاہی دربار کے عہدہ داروں کی لڑکیاں، امراؤ و رؤسا کی بیٹیاں سب ہی کا جمگھٹ تھا، یوں نظر آتا تھا جیسے کوئی پرستان اس چھوٹی سی سرزمین پر آباد ہوگیا ہے۔ حسن و جمال رعنائی اور زیبائی کی فصل بہار، یہاں اور صرف یہاں موجود تھی،

چونکہ اس مجمع میں کوئی بڑی بوڑھی عورت نہ تھی، وہ سب محل کے دوسرے حصہ میں داد کلام دے رہی تھیں، لہٰذا یہ ٹولی پوری بے فکری اور اطمینان کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ —— ہنسی —— قہقہے چہچہے، طنز، مذاق، جلے کٹے فقرے، دلچسپ پر لطف اور چبھتے ہوئے جوابات، غرض ایک محفل رنگ و بو تھی، جو عروج شباب پر پہنچی ہوئی تھی،!

اسی مجمع میں ایک حور وش اور گل اندام لڑکی، سادگی اور سادگی کے ساتھ، وقار و تمکنت کا پیکر بنی بیٹھی تھی، بدن پر کچھ ایسے قیمتی زیورات تھے، نہ گراں مایہ ملبوسات پھر بھی اس کی دھج کچھ ایسی تھی کہ ستاروں کی محفل میں چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہی تھی، اور یہ سب اسے اس طرح گھیرے ہوئے تھیں کہ جیسے وہ کوئی بہت بڑی ہستی ہے، حالانکہ وہ شہر کے ایک نامو لیکن تباہ حال خاندان کی ایک فرد تھی، کسی زمانہ میں اس خاندان کا طوطی بولتا تھا، دور کے رشتہ سے معلوم نہیں کہاں — آگے جا کر تیمور سے شجرہ نسب بھی ملتا تھا، یہ ماضی کی تاریخ تھی، حال کی تاریخ یہ تھی کہ عزت آبرو سے گزر ہو رہی تھی، پھاٹک پر ہاتھی تو نہیں جھوٹا تھا لیکن یہ سچ ہے کہ پھاٹک تھا، اور یہی ثبوت تھا گذشتہ جاہ و جلال اور عظمت و حشمت کا ——!

تھوڑی دیر میں ملکہ زینت محل خراماں خراماں کسی کام سے ادھر تشریف لائیں،

ساتھ کہا :-

چل ہٹ میری کشور پر ان کا جو شعر صادق آتا ہے وہ نہیں، یہ ہے۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر تیرے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی، اور کشور کی تھوڑی ہاتھ میں لے کر بولی،

"کیوں کشور میں غلط تو نہیں کہتی؟"

یہ بات بھی کہ فرخ سلطانہ اور کشور آرا میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی، کشور کے والد اور فرخ سلطان کے والد میں گہری دوستی تھی۔ دونوں کے ملاپ نے اس گھر کی عورتوں میں الفت اور محبّت کا رشتہ پیدا کر دیا تھا۔ یوں تو قلعہ کی اکثر شہزادیاں کشور کی صورت اور شخصیت سے واقف تھیں، لیکن فرخ سلطان اس سے ایک قسم کا لگاؤ سا پیدا ہو گیا تھا، وہ ایسے موقعوں پر اس کی تاک میں رہتی، اور جب بھی ملاقات ہو جاتی تو پھر کئی کئی دن اپنا مہمان بنا کر رکھتی، اور تہوّر حسین کے اصرار اور خود کشور کی التجا اور التماس کے باوجود نہ چھوڑتی۔

کچھ دیر یہ دونوں اس طرح کی باتیں کرتی رہیں، پھر فرخ نے کشور کے کان میں کہا،

"یہاں بیٹھ کر کیا کرو گی، ہر طرح کے لوگ ہیں، نہ مزاج کے موافق باتیں ہوں گی نہ طبیعت کے مطابق مجلس ہو گی، چلو ہمارے چمن میں چل کر بیٹھو، وہاں جھولا پڑا ہے، ہم تم جھولیں گے اور پکوان بھی پک رہا ہے اس سے بھی لطف اُٹھائیں گے،!

"بڑی اچھی تجویز ہے، میری خود بھی یہاں طبیعت گھبرا رہی ہے، وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے،!

ملکہ زینت محل نے جاتے جاتے فرمایا۔

"ہمارے دل میں تو ان کی بڑی قدر ومنزلت ہے، ابھی کل ہی کوئی ذکر آیا تو جہاں پناہ فرما رہے تھے، بڑا کھرا اور صاف دل آدمی ہے لیکن نہ جانے کیوں ہم سے کھچے کھچے سے رہتے ہیں، ——— جہاں پناہ کی خدمت میں اگر وہ ہوئے تو میں ضرور یہ بات پوچھوں گی!"

کشور آرا نے کوئی جواب نہ دیا، اور ملکہ زینت محل مسکراتی ہوئی چلی گئیں!

قلعہ کی شہزادیوں میں شہزادی فرخ سلطانہ بڑی نٹ کھٹ اور چلبلی طبیعت کی تھیں، ملکہ زینت محل کے تشریف لے جانے کے بعد انہوں نے کہا۔

"کشور آرا ہم تو مغالطے میں پڑ جاتے ہیں تم کو دیکھ کر، خواہ مخواہ لوگوں نے ہمیں بدنام کر رکھا ہے، شہزادی کہہ کر!"

ایک خواص بولی:-

سچ پوچھئے تو یہ معلوم ہوتی ہیں شہزادی!

فرخ سلطانہ نے کہا:-

"بڑی سے بڑی شاہی محفل میں ہماری کشور آرا کو بٹھا دو، کیا مجال ہے جو دیکھنے والے کی آنکھ جھپک جائے!"

ایک دوسری خواص نے دست بستہ عرض کیا:-

"جی بجا ارشاد، وہ ہمارے دلّی کے ایک بڑے مشہور شاعر گزرے ہیں خواجہ میر درد یہ شعر انہوں نے آپ جانتی ہیں کس کے لئے کہا تھا، ؟

بات محفل میں ترے حُسن کے شعلہ کے حضور
شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

شہزادی فرخ سلطان نے کشور آرا کو گلے سے لگا لیا اور بڑے تیور کے

سامنا

کشور آرا اور شہزادی فرخ سلطان خیمہ میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، فرخ کی ایک منہ چڑھی خواص بھی موجود تھی، وہ پکوان کا انتظام واہتمام کر رہی تھی، دوسری باندیاں اور خواصیں اپنے کام میں لگی تھیں، ایک زر کار مسند پر، گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے فرخ سلطان بیٹھی تھی، اس کے پہلو سے پہلو ملائے کشور آرا۔ فرخ سلطان نے کہا "بہت دنوں کے بعد قابو میں آئی ہو، اب تم ایک ہفتہ تک نہیں جا سکتیں یہاں سے"!

کشور آرا نے جواب دیا، ایک ہفتہ کیا میں تو مہینہ بھر رہ جاؤں، لیکن نہ ابا جانی اپنی نظر سے اوجھل ہونے دیتے ہیں، نہ امی حضور!

فرخ سلطان۔ اے ہے، کب تک ماں باپ کے کلیجہ سے لگی بیٹھی رہو گی؟ آخر کو شادی ہو گی، اور کچے دھاگے میں بندھی سسرال جاتی نظر آؤ گی"!

کشور آرا۔ یہ دن تو سبھی کو دیکھنا پڑتا ہے تم کیا بچ جاؤ گی؟

فرخ سلطان۔ ہمارا کیا ہے شادی کسی سے ہو، رہیں گے تو قلعہ میں تیموری شہزادیاں قلعہ سے باہر تو کہیں جاتیں نہیں لیکن تمہاری شادی ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی ہو جانا پڑے گا —— پھر!

کشور آرا۔ کوئی زبردستی ہے؟ جائیے ہم ہی نہیں کرتے"!

فرخ سلطان۔ واہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ بھلا؟ وہی ماں باپ جو آج آنکھوں سے ایک پل کے لئے اوجھل نہیں ہونے دیتے، بڑی دھوم دھام سے شادی کریں گے اور خیر سے رخصت کر دیں گے پھر کیا کرو گی؟

کشور آرا۔ کچھ نہیں، ہم پہلے سے نہیں سوچتے کوئی بات جب وقت آئے گا، دیکھا جائیگا ــــــ ابھی چند دن ہوئے، ابّا جانی سے امّی حضور کہہ رہی تھیں لڑکی سیانی ہوگئی ہے، کئی جگہ سے پیام بھی آرہے لیکن تم مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو، آخر کب کرو گے بیاہ اس کا؟ وہ کہنے لگے، کون سی بوڑھی ہوئی جارہی ہے کشور، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ جب وقت آئے گا، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ــــــ!

فرخ سلطان۔ یہ سن کر تو اوس پڑگئی ہوگی تم پر، شادی کی بات کچھ ایسی ہی ہوتی ہے، معاملہ ہوا ہوا، ٹلا تو ٹلا،

کشور آرا۔ مجھے تو سچ کہتی ہوں، خوشی ہوئی،

فرخ سلطان۔ خوشی ہوئی؟ کیسی اُلٹی باتیں کرتی ہو؟ بھئی دیکھو ہم میں تم میں کوئی پردہ تو ہے نہیں، ہم تو اپنے دل کی بات تم سے چھپاتے نہیں، اور تم چھپاتی بھلا دوست ایسے ہوتے ہیں کہیں؟

کشور آرا۔ یہ لیجئے، آپ بھی کیسی باتیں کرنے لگیں، دُنیا میں اگر کوئی سچا دوست ہے تو آپ، بھلا آپ سے چھپاؤں گی کچھ؟ سچ مجھے خوشی ہوئی ابّا جانی کی اس بات سے ــــــ!

فرخ سلطان۔ آخر کیوں؟ ہم تو اس دن کے منتظر ہیں، جب صاحب عالم، مرزا مغل ــــــ

یہ کہتے کہتے، فرخ سلطان شرما سی گئی، خود بخود اس کی آنکھیں نیچی ہوگئیں،

یہ اندھیر!

کشور آرا:- جی نہیں اطمینان رکھیئے یہ بھی نہیں ہوگا، کیا آپ صاحب عالم مرزا مغل کو خود ہی ڈھونڈنے نکلی تھیں!؟

کشور نے یہ بات کچھ ایسی بے ساختگی کے ساتھ کہی کہ فرخ سلطان کو ہنسی آگئی خود کشور بھی ہنسنے لگی، قہقہوں کے اس شور میں دفعتہً سراپردہ کو جنبش ہوئی، کشور اور فرخ دونوں اس طرف دیکھنے لگیں جواں بخت اندر آچکا تھا اس کی نظر کشور پر پڑی، اور وہ حیرت سے اسے تکنے لگا لیکن فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ نامناسب بات ہے، اس نے فرخ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم تو آپ کے پاس پکوان کھانے آئے تھے!"

فرخ سلطان نے تبسّم کو روکتے ہوئے زبردستی سنجیدہ بن کر کہا۔

لیکن بلا اجازت یہاں آ کیسے گئے؟ تمہیں معلوم نہیں، یہاں کوئی اور بھی ہے

جواں بخت نے برجستہ جواب دیا۔

"کوئی اور بھی ہے، یہ تو آ کر معلوم ہوا، اگر آپ حکم دیں تو ابھی واپس چلا جاتا ہوں لیکن ——

وہی مصنوعی سنجیدگی قائم رکھتے ہوئے فرخ سلطان بولی۔

"ہاں تمہیں واپس چلا جانا چاہیئے لیکن ——

"لیکن کیا؟ کیا کہہ رہے تھے تم؟"

جواں بخت نے سنجیدہ بن کر کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں خود نہیں آیا تھا، آپ جانتی ہیں، کوان پکوان کا مجھے کچھ زیادہ شوق بھی نہیں، لیکن صاحب عالم مرزا مغل بڑی دیر سے پیچھے پڑے ہیں کہ خود بھی چکھ لوں۔ اور ان کے لئے بھی بطور نمونہ کچھ لیتا جاؤں، اب آپ جیسا فرمائیں عرض

کشور نے زیرلب تبسم کرتے ہوئے کہا۔

کشور آرا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے، مرزا مغل آپ کو چاہتے ہیں، آپ ان سے محبت کرتی ہیں، میں بھی اگر کسی سے محبت کرتی تو شاید آپ سے زیادہ۔

اتنا کہتے کہتے خود کشور آرا بھی شرما گئی، اس کا خوبصورت چہرہ کچھ دمک سا گیا، فرخ سلطان اب سنبھل گئی تھی، اپنے آپ میں آگئی تھی اس نے کہا۔

فرخ سلطان۔ تو تم کسی سے محبت نہیں کرتیں کشور؟

کشور آرا۔ کس سے کروں؟ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، کسی راہ چلتے کو بلا کر اس سے اظہار محبت شروع کرنے سے رہی، بات یہ ہے کہیں آبا جانی کی اکلوتی لڑکی ہوں اور ہم لوگ کہیں آنے جانے کے عادی نہیں، لے دے کے وہی گھر ہے وہی گھر کے لوگ، امی حضور، ابا جانی، بی مغلانی۔ دو تین خادمائیں، اللہ اللہ خیر سلا۔

فرخ سلطان۔ وہ دن بھی آئے گا، مل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی پرستار کسی دن!

کشور آرا۔ بس تو پھر محبت بھی کرنے لگیں گے ہم اس سے۔ لیکن جب تک وہ مبارک دن نہیں آتا، صرف امی حضور اور ابا جانی ہی سے محبت کرنی پڑے گی!

فرخ سلطان ہنسنے لگی، پھر ایک ادائے جانستاں کے ساتھ بولی، پھر تمہارے لئے کوئی محبت کرنے والا ڈھونڈنا چاہیئے، اچھا کبھی کریں گے تمہاری خاطر یہ کام بھی،

کشور آرا۔ جی بخشئے میں ایسی محبت کی قائل نہیں آپ نے کوئی محبت کرنے والا ڈھونڈا تو وہ میرے کس کام کا؟

فرخ سلطان۔ تو پھر خود ہی چراغ رخ زیبا لے کر تلاش کرو، ہائے غضب

پوچھو تو ہے بھی اس قابل کہ اسے چاہا جائے، کون سی خوبی ہے جو اس جواں بخت
اور جواں سال شہزادے میں نہیں !"

کشور آرا بولی:" ہاں تعریف تو میں نے بھی سُنی ہے!"

فرخ سلطان - لیکن قابل تعریف پایا نہیں ؟

کشور آرا - یہ لیجیے، اس سوال کا جواب میں کیا دے سکتی ہوں؟ میں نے تو آج پہلی
مرتبہ دیکھا، کسی آدمی کے بارے میں فیصلہ اس کے گن اور سبھاؤ سے کیا جاتا ہے
آپ کا ان سے ملنا جُلنا ہوتا رہتا ہے، آپ ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں، میں نے
تو جو سنا تھا، وہ کہہ دیا، ——!

فرخ سلطان - لیکن تمہارے ابا جانی تو اس کے بڑے کٹر مخالف ہیں!

کشور آرا - ہوں گے، میں کیا جانوں!

فرخ سلطان - گھر میں کبھی بات چیت نہیں ہوتی ؟

کشور آرا - اب تو بہت دنوں سے نہیں ہوئی، لیکن اتنا یاد ہے کہ ایک مرتبہ ابا جان
فرما رہے تھے صاحب عالم مرزا قویاش، ولی عہدی کے زیادہ مستحق ہیں لیکن
اب ان کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کہتے،!

فرخ سلطان - "ان سے تو ہمارے صاحب عالم مرزا مغل لاکھ درجہ بہتر ہیں تلوار کے
دھنی، بات کے پکے"، دوستی کے کھرے، ہاں یہ ضرور ہے ذرا تنگ مزاج ہیں
غصہ جلد آجاتا ہے - کان کے بھی ذرا کچے ہیں، دوسروں پر اعتبار جلد کر لیتے ہیں
نقصان اُٹھاتے ہیں -!

کشور آرا - ہاں اور کیا، —— صاحب عالم مرزا مغل شہزادہ جواں بخت سے بڑے
بھائی ہیں نا؟

فرخ سلطان - ہاں، —— کئی سال بڑے ہیں سب میں چھوٹا یہی ہے جواں بخت

کر دوں جا کر، میں تو صرف ایلچی ہوں، مجھے تو آنکھیں دکھایئے نہیں، !

فرخ سلطان ہنسی ضبط نہ کر سکی ہنستے ہنستے اس نے کہا۔

" بڑے شریر ہو گئے ہو، دیکھ لینا جہاں پناہ سے تمہاری شکایت کروں گی "

کشور کا یہ عالم تھا کہ وہ چھوٹی موئی کی طرح لجائی جا رہی تھی، ایک پیکر خاموش کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی، جواں بخت کی آمد ایسی غیر متوقع اور بے سان و گمان تھی کہ نہ وہ خیمہ سے باہر جا سکی نہ اپنے آپ کو سمیٹ کر درست کر سکی، جیسے بیٹھی تھی، ویسی ہی کھڑی ہو گئی، ایک بت کی طرح اور جواں بخت اگرچہ باتیں فرخ سے کر رہا تھا، لیکن نظروں سے دیکھ کشور کو رہا تھا۔ فرخ نے کہا۔

" کب تک کھڑے رہو گے، جاتے کیوں نہیں"؟ بولا،

" ابھی چلا جاتا ہوں، لیکن یہ تو بتایئے صاحب عالم مرزا مغل سے کیا کہوں انہوں نے پکوان کے لالچ میں کل سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے، ـــــ فرح سلطان نے ایک ادا کے ساتھ کہا،

ہم نے تو پکوان اپنے لئے پکوایا ہے، یہ کوئی لنگرخانہ تو ہے نہیں کہ جس کا جی چاہے صدا لگائے، اور کشکول بھر کر جائے، ـــــ بس یہی جواب ہے اب تم جاتے ہو یا پھر ـــــ

جواں بخت نے واپس جاتے ہوئے کہا،

" بہت اچھا چلا جاتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا جواں بخت مسکراتا ہوا چلا گیا، اس کے جانے کے بعد، فرخ سلطان نے کشور آرا سے کہا۔

" یہ تھے ہمارے شہزادہ جواں بخت، خدا نظر بد سے بچائے ہمہ صفت موصوف ہیں، جہاں پناہ اپنی اولاد میں کسی کو اتنا نہیں چاہتے، جتنا جواں بخت کو، اور سچ

ماں کا فیصلہ

یہ چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا ——— دل ——— بھی عجیب چیز ہے، کسی کے ساتھ ساری عمر گذار دیتا ہے، مگر ذرا انوس نہیں ہوتا، کسی کو ایک نظر دیکھ لیتا ہے، اور اسی کا ہو رہتا ہے۔

میلہ کی سیر ختم ہو گئی، لوگ اپنے اپنے گھر پہنچ گئے، شاہی قافلہ بھی قلعہ میں آگیا، فرخ سلطان اپنی حویلی میں کشور آرا اپنے گھر میں پہنچ گئیں، اور سب اپنے روز مرّہ کے معمولات میں لگ گئے۔ لیکن جوان بخت اس طرح آیا، کہ اپنا سب کچھ اسی خیمہ میں چھوڑ آیا، جہاں اس نے پہلی اور آخری بار کشور آرا کو دیکھا تھا، ! اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا، وہ کون ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟ اس کا نام کیا ہے۔ اس کے خاندان کے روایات کیا ہیں؟ یہ سب کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، لیکن فرخ سلطان کے سوا کسی اور سے معلوم نہیں کر سکتا، اور فرخ سلطان، اتنی طرّار تھی کہ اگر بھنک بھی مل جاتی کہ جوان بخت کشور پر مائل ہے تو سارا قلعہ سر پر اٹھا لیتی۔ ایسا ایسا چھیڑتی کہ بیچارے سے روتے بھی نہ بن پڑتا، یہی سوچ کر وہ خاموش ہو جاتا تھا، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ فرخ سلطان کی حویلی تک گیا، دروازہ کے اندر قدم نہیں رکھا واپس آگیا، وہ اپنے عشق کی رسوائی سے اتنا نہیں ڈرتا تھا، جتنا کشور کی رسوائی سے خائف تھا، اسے اندیشہ تھا کہیں فرخ، کشور کو نہ چھیڑنا شروع کر دے،

کشور آرا۔ صرف جھوٹا کھوٹا تو نہیں؟

فرخ سلطان۔ اے نہیں، بالکل نہیں، بڑی خوبیوں کا آدمی ہے۔ —— ہم لوگ باتوں میں ایسے لگے ہیں کہ جھولے کو چلو ذرا جھولیں چل کر کیوں صنوبر جھولا بالکل ٹھیک کر لیا نا؟

صنوبر۔ جی بالکل ٹھیک خالی نہیں ہے۔ دیکھ لیجئے، یہاں سے دکھائی تو دے رہا ہے، شہزادے صاحب، کیسے بڑے بڑے پینگ لے رہے ہیں،

فرخ سلطان نے، اور اس کے شانے سے لگ کر کشور آرا نے سرا پردہ کی اوٹ سے جھانکا، تو واقعی جواں بخت بڑھ بڑھ کے پینگ لے رہا تھا۔ فرخ مسند پر مسکراتی ہوئی آکر بیٹھ گئی کہنے لگی،

" لڑکپن ہے کہ مزاج سے کسی طرح جاتا ہی نہیں، —— جا صنوبر کہہ دے ہم لوگ جھولنے آرہے ہیں، وہ کہیں اور مشق کریں جاکر —— !

ذرا دیر میں صنوبر واپس آئی اور اس نے کہا،

" وہ نہیں اترتے کہتے ہیں، جھولا بہت بڑا ہے اس پر چار آدمی بڑے مزے میں جھول سکتے ہیں صاحب عالم مرزا مغل کو بھی میں نے پیام بھیج دیا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے !"

فرخ، اور کشور دونوں مسکرانے لگیں !

اِدھر ملکہ زینت محل ایک عرصہ سے اپنے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کے بیاہ کا ارمان لئے بیٹھی تھیں، لیکن پے درپے کچھ ایسے حالات وحوادث پیش آتے رہے کہ نہ اس معاملہ کا وہ بادشاہ سلامت سے تذکرہ کرسکیں، نہ جواں بخت کا عندیہ لے سکیں، اب انہوں نے پھول والوں کے میلہ سے واپسی کے بعد جو، جواں بخت کو کچھ کھویا کھویا سا پایا، تو ماتھا ٹھنکا، دوسرے شہزادوں کے کرتوت ان کے سامنے تھے، ڈریں کہیں لیا نہ ہو میرا بیٹا، جو خوبصورتی میں چاند کو، اور آب وتاب میں ہیرے کو شرماتا ہے، ہاتھ سے نکل جائے وہ دل ہی دل میں سوچنیں، یا تو، یہ کسی عورت کے جال میں پھنس گیا ہے، یا کہیں دل دے بیٹھا ہے، دونوں صورتیں خطرناک ہیں، اس کی ذات کے لئے بھی، اور خاندان شاہی کے وقار کے لئے بھی، انہوں نے فیصلہ کرلیا جلد از جلد جواں بخت کی شادی کر دینی چاہیئے، خاندان میں بہت سی لڑکیاں تھیں، ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت اور طرحدار، کہیں بھی وہ جواں بخت کا پیغام دیتیں کسی کی مجال نہیں تھی کہ انکار کرسکتا، اس لئے نہیں کہ وہ شہزادہ تھا، بہادر شاہ محبوب بیٹا تھا، صرف اس لئے کہ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا، کردار ہمالہ کی طرح بلند، صورت چاند کی طرح روشن، عزم چٹان کی طرح اٹل، شجاعت شیر کی طرح مسلّم، پھر اس کی بھاری بھرکم شخصیت، بھارت کے تاجدار کا نورِ نظر اور لختِ جگر، ہر گھر میں اس کا پیام فخر اور مسرّت کے ساتھ قبول کیا جاتا، کوئی رکاوٹ سامنے نہ تھی، کوئی دشواری حائل نہ تھی، ملکہ نے فیصلہ کرلیا، ہوگی، اور جلد ہوگی، بہادر شاہ کے بارے میں تو کوئی اندیشہ نہ تھا، وہ ملکہ زینت محل کی رائے رد نہیں کرسکتے تھے، جواں بخت بھی اتنا سعادت مند اور خوش اطوار تھا کہ اس کی طرف سے بھی کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں تھا، پھر بھی یہ تقاضائے احتیاط شہزادے کا عندیہ معلوم کرلینا ضروری تھا، لاکھ سعادت مند اور خوش اطوار سہی، زندگی اس کو نباہنی ہے، اس پر صرف یہ فیصلہ نافذ کیا

جا سکتا ہے کہ شادی جلد سے جلد ہو جائے لیکن کس سے ہو؟ اس سلسلہ میں اگر وہ کوئی رائے رکھتا ہے تو اس کا پاس و لحاظ کیا جائے،

ملکہ زینت محل یہی سوچ رہی تھیں کہ اتفاق سے جواں بخت ادھر نکل آیا، اسے دیکھ کر وہ کھل گئیں، بڑے چاؤ اور پیار کے ساتھ کہا،

زینت محل۔ بڑی عمر، ہم اس وقت تمہی کو یاد کر رہے تھے خوب آ گئے!

جواں بخت۔ ارشاد امی حضور، اس ناچیز کو کیسے یاد فرمایا؟

زینت محل۔ وہ تو ہم بتا دیں گے، پہلے تم ایک سوال کا جواب دو۔

جواں بخت۔ جی فرمایئے،

زینت محل۔ کئی دن سے تم کچھ پریشان، افسردہ اور مضمحل سے نظر آ رہے ہو، آخر اس کا سبب؟

جواں بخت۔ (ذرا پریشان ہو کر) جی کوئی خاص بات نہیں، آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں، اچھا ہوں بالکل میں تو!

زینت محل۔ کیا یہ بات صرف اس لئے مان لی جائے کہ تم کہہ رہے ہو؟

جواں بخت۔ (اور زیادہ پریشان ہو کر) لیکن غلام غلط تو نہیں عرض کرتا؟

زینت محل۔ بالکل غلط کہہ رہے ہو، تم ہمارے بیٹے ہو، اتنے سے اتنے بڑے ہوئے ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے، چھپا نہیں سکتے، سچ کہو، سچ بولنے کی کوشش کرو، کیا تمہاری نظر میں ماں سے بڑھ کر بھی کوئی راز دار ہو سکتا ہے ہم نے تمہاری صحت اور زندگی کے لئے راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں تمہیں ذرا تکلیف ہوئی، اور ہم پر نزع کا عالم طاری ہو گیا، تمہیں ذرا روتا دیکھا اور ہمارا دل بھر آیا، وہ کون سی ضد تھی جو ہم نے پوری نہیں کی؟ وہ کون سی خواہش تھی جسے ہم نے تسلیم نہیں کیا، ـــــ کیا یہ سب کچھ اس واسطے کیا تھا،

آخر بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا،
"آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی، آپ کو خوش دیکھنے اور خوش رکھنے کے لئے اگر جان بھی کام آجائے، تو بخدا دریغ نہیں کروں گا، لیکن امی حضور، اس تقریب کی ایسی جلدی کون سی ہے؟

زینت محل - (تیوری چڑھا کر) کیوں؟ —— اعتراض ہے تمہیں کچھ؟

جواں بخت - جی نہیں اعتراض کی تو کوئی بات نہیں، اور اگر ہو بھی تو یہ مجال کہاں کہ آپ کی کسی بات کو رد کر دوں؟ گذارش صرف اتنی تھی کہ اس وقت ملک کے حالات خطرناک ہو رہے ہیں، انگریزوں کا استبداد بڑھتا جا رہا ہے۔ رعایا میں بد دلی پیدا ہو رہی ہے۔ خود جہاں پناہ طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہیں بھا حبِ عالم مرزا قویاش نے جن شرائط پر ولی عہدی قبول کی ہے، انہوں نے ملک کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ میرے ناچیز خیال میں یہ وقت شادی کے لئے ذرا بھی سازگار نہیں۔ یہ وقت ہے جنگ و پیکار کا، جہاد و قتال کا، مر جانے کا یا مار ڈالنے کا۔ بھلا ایسے موقع پر شادی رچانا اچھا لگ سکتا ہے کسی کو؟ رعایا کے دل میں بدگمانی پیدا ہوگی، کہ وہ تو مصائب میں گرفتار ہے، اور ہم رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔!

زینت محل - (مسکرا کر) بیٹے تم نے باتیں بڑی اچھی کہیں، اور بڑے عمدہ طریقہ سے پیش کیں۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ وقت جنگ و پیکار اور جہاد و قتال کا ہے اور اگر وہ وقت آیا، تو تم دیکھ لوگے عورت ہونے کے باوجود، زینت محل بھی گھر میں بھی نہیں بیٹھی رہے گی، ماں ہونے کے باوجود، وہ اپنے لختِ جگر کی کمر میں تلوار باندھے گی، اور اسے میدانِ جہاد میں بھیجے گی۔ بیوی ہونے کے باوجود وہ اپنے تاجدار شاہ ذی جاہ کو۔ ان کی طرف جاتا دیکھے گی، اس کی آنکھ میں، اگر آنسو

کہ جوان ہوکر ہم سے آنکھیں پھیرلو؟ ہم سے اپنی باتیں چھپاؤ ہم پر اعتماد نہ کرو ــــــ؟
یہ کہتے کہتے ملکہ زینت محل کی آنکھیں بھر آئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
جواں بخت یہ کیفیت دیکھ کر بیتاب ہوگیا، وہ آگے بڑھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر خود بھی سسکیاں لے لیکر رونے لگا، ملکہ زینت محل نے بڑی محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بڑی دیر تک تھپکتی رہیں، پھر اس کا منہ اُٹھایا، اور پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

بیٹے، ــــــ تم ضرور پریشان ہو، ضرور کوئی خاص فکر ہے تمہیں؟ یہ اُترا ہوا چہرہ دلی پریشانی کی غمازی کر رہا ہے، جو بات ہو ہم سے کہو، تمہاری جو خواہش ہوگی، ــــــ پوری ہوگی ــــــ!

جواں بخت نے جواب دیا، میری کوئی خواہش نہیں، اگر ہے تو صرف یہ کہ آپ کی جو مرضی اور خواہش ہو، وہ پوری ہو، جو آپ کی خواہش ہوتی ہے وہ میری خواہش اور تمنا بن جاتی ہے!

زینت محل نے مسکراتے ہوئے پوچھا، "سچ کہتے ہو، مکر تو نہیں جاوگے اپنے قول سے؟

جواں بخت نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "امی حضور، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، آپ کہہ کے تو دیکھیے، !"

زینت محل نے اپنے اُوپر سنجیدگی طاری کر لی اور بولیں: "تو ہماری خواہش یہ ہے کہ جلد از جلد تمہاری شادی ہوجائے۔ اس کام میں اب تاخیر نہیں روا رکھی جا سکتی، ــــــ بتاؤ کیا اب بھی اپنے عہد پر، اپنے قول پر قائم ہو؟

یہ اتنا اچانک اور غیر متوقع سوال تھا کہ جواں بخت چکرا گیا۔ اس کے حواس غائب ہو گئے، کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے، لیکن خاموش بھی نہیں رہا جا سکتا تھا،

حیرت کے ساتھ کہا۔

"میری رائے یا تجویز؟"

زینت محل نے سراپا محبّت و شفقت بن کر کہا۔

"ہاں تو کیا ہوا؟ آخر زندگی تمہی کو نباہنی ہے، سوچ لو، ہم تمہاری رائے کا انتظار کریں گے، اس کے بعد جہاں پناہ سے رجوع کریں گے!

جواں بخت چُپ چاپ باہر چلا گیا۔!

ہوں گے بھی تو رنج اور خوف کے نہیں مسرت اور خوشی کے۔

جواں بخت بے شک مجھے اپنی ماں سے، اپنے ملک کی ملکہ سے یہی توقع ہے!

زینت محل لیکن میرے بچے جب تک وہ وقت نہیں آتا ہم تمہارا سہرا کیوں نہ دیکھ لیں؟ تمہارے لئے چاند سی بیوی کیوں نہ بیاہ لائیں ممکن ہے خدا تمہیں ایک بچہ کا باپ بنادے اور ہم اس پر فخر کریں کہ ہمارے بیٹے کا بچہ ہے ــــ ــــ اور پھر یہ بھی تو سوچو، نہ معلوم ان حالات کا انجام کیا ہو، یہ خدا ہی جانتا ہے، اگر جنگ ہوئی تو جام شہادت کون پیئے گا اور سرخ رو ہوکر میدان سے کون آئے گا؟ ممکن ہے، جنگ کے بعد ہم نہ رہیں، کیا تم اسے گوارا کرو گے کہ تمہاری شادی اور بیاہ کی حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں؟

جواں بخت ۔خدا نہ کرے، یہ آپ کیا فرما رہی ہیں ــــ؟

زینت محل ۔تو تمہیں ہماری بات ماننی پڑے گی۔

جواں بخت ۔میں نے انکار کب کیا تھا امی حضور ــــ؟

زینت محل ۔شاباش، ــــ تم نے ہمارا دل خوش کر دیا،!

جواں بخت ۔(سر جھکاتے ہوئے) لیکن امی حضور یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے آپ اپنی بہو بنانے کے لئے کسے منتخب کیا ہے؟

زینت محل ۔ یہ فیصلہ ابھی تو نہیں کیا جہاں پناہ سے مشورہ کے بعد ہفتہ عشرہ میں کریں گے، اصل مقصد تو تمہارا عندیہ لینا تھا، وہ لے لیا، ــــ ہاں، اگر تم خود اس سلسلہ میں کوئی رائے یا تجویز رکھتے ہو، تو ہم خوشی سے اس پر بھی غور کریں گے۔

یہ سنکر جواں بخت کا چہرہ فرطِ مسرت سے پھول کی طرح کھل گیا، اس نے بڑی

مذاق" انے گا، بھلا یہ بیل کہیں منڈھے چڑھ سکتی ہے؟

لیکن نہیں، ـــــ جس کا چہرہ اتنا حسین ہو جس کی آنکھوں میں حجاب و نا کی ایسی آمیزش ہو، اس میں صرف خوبی ہی ہو سکتی ہے، اچھا مان لیا، وہ ہمہ خوبی ہے اس کی مجموعۂ اوصاف ہے، لیکن پھر ـــــ ؟کیا وہ مل سکتی ہے؟ ممکن ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہو، ممکن ہے اس کی منگنی ہو چکی ہو، ممکن ہے وہ کسی اور سے محبت کرتی ہو پھر کیا ہے محبت کرنا جائز ہے؟ یہ گتھی صرف فرخ سلطان ہی سے حل ہو سکتی ہے۔ اس کے پاس چلنا چاہیئے، اسے ٹٹولنا چاہیئے۔

دل سے یہی باتیں کرتا ٹھنڈی سانسیں بھرتا وہ فرخ سلطان کی حویلی کی طرف جا نکلا، وہ صحنچی میں ٹھاٹھ سے اپنی سہیلیوں اور خواصوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی، جوان بخت کو آتا دیکھ کر سب رفوچکر ہو گئیں، وہ آیا اور خاموشی کے ساتھ فرخ سلطان کے پاس بیٹھ گیا، فرخ سلطان نے بڑے پرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اور پان دیتے ہوئے کہا۔

فرخ سلطان۔ آج کہاں بھول پڑے تم؟ سوچ رہی ہوں یہ عید سے پہلے عید کا چاند کیسے نکل آیا؟

جوان بخت۔ اور کہہ لیجئے کچھ، کوئی حسرت باقی نہ رہنے پائے ـــــ"

فرخ سلطان۔ ضرور کوئی بات ہے ـــــ

"کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں"

لیکن تم تو کسی سے لڑنے جھگڑنے کے بھی عادی نہیں!

جوان بخت۔ جی نہیں، کسی سے لڑ کر تو نہیں آیا، البتہ آپ سے لڑنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

فرخ سلطان۔ مجھ سے جنگ کرنے آئے ہو؟

اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہُوئی!

زینت محل نے جواں بخت کو اگر مہلت نہ دی ہوتی، تو شاید، وہ جوش اطاعت اور سعادت مندی میں بے چون وچرا جس سے شادی کر دی جاتی کر لیتا خواہ زندگی تلخی کے ساتھ گزرتی یا نشاط ومسرت کے ساتھ، لیکن اس مہلت نے، اس کے طائر خیال کو پر پرواز عطا کئے اور وہ سیدھا کشور آرا کے حضور میں پہنچ گیا، اس کی رعنائی اور زیبائی پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی، اس کی سادگی اور معصومیت میں کچھ عجیب شان دل آویزی پیدا ہو گئی تھی، اس کا وقار نسائیت کچھ ایسا بلند بام نظر آتا تھا کہ وہاں تک ہاتھ تو ہاتھ نظر کا پہنچنا محال تھا، وہ محسوس کر رہا تھا، زندگی اگر نشاط ومسرت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے، تو صرف اس لڑکی کے ساتھ جو فرخ سلطان کے خیمہ میں اس دن پیکر تمکین ووقار بن کر نظر آئی تھی، ! ——

لیکن کون تھی وہ؟ ——

میں اس کا نام نہیں جانتا، اس کے خاندان سے واقف نہیں، اس کے کردار وسیرت کا مجھے علم نہیں، اس کے عادات واطوار اور خصائل سے ناواقف، کیا اس سے بڑی بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ اسے چاہنے لگوں؟ اس کے بغیر زندگی میں ایک خلا سا محسوس کروں؟ اس کے حصول کو حاصل حیات سمجھنے لگوں؟ صرف ایک نظر ایک لڑکی کو دیکھا، اور دل دے بیٹھا، محبت کرنے لگا، اس سے — جلنے لگا،

—— یہ بھی اچھی رہی، !

فرخ سلطان۔ آخر تمہیں ہمارے جھولے پر بیٹھنے کا حق کیا تھا؟ —— وہ بھی جبکہ ہمارے پاس ایک مہمان موجود تھا، اور ہمیں اس کی خاطرداری منظور تھی، !

جواں بخت۔ مہمان؟ —— ہاں ایک لڑکی کھڑی تو تھی۔ آپ کے پاس سمجھ کانے کون تھی وہ؟ کیا انتقال ہوگیا بیچاری کا؟

فرخ سلطان۔ خدا نہ کرے، کوئی بھی تھی تمہیں کیا! کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟

جواں بخت۔ آپ کی بد ذوقی پر ماتم کرنے کا جی چاہ رہا ہے؟ —— کہاں آپ کہاں وہ کہاں سورج، کہاں ریت کا ایک ذرّہ؟ کہاں مخمل کہاں ٹاٹ، کہاں، دودھ اور شہد کی نہر کہاں گدلا پانی، ؟

فرخ سلطان۔ (ہنس کر) کچھ سودائی ہوگیا ہے لڑکے —— مخمل کون ہے اور ٹاٹ کون؟

جواں بخت۔ آپ اور وہ لڑکی؟ —— آپ نے اسے اپنے پاس آنے کیوں دیا بھلا آپ کا اور اس کا کیا ساتھ ——؟

فرخ سلطان۔ (ہاتھ جوڑ کر) خدا کے لئے معاف کردیجیں —— آخر کیوں ستانے کے لئے آ گئے، !

جواں بخت۔ اچھا چلا جاتا ہوں —— میں تو صاحب عالم مرزا مغل کا ایک پیغام لے کر آیا تھا، نہیں سنتیں نہ سنیئے۔ میں چلا، !

فرخ سلطان۔ مجھے پیام و یام سننے کی ضرورت نہیں، جاؤ، خدا کے لئے جاؤ میں نہیں سننی کچھ،

جواں بخت۔ تو سنا بھی کب رہا ہوں، اچھا ایک بات بتایئے، !

فرخ سلطان۔ (ماتھے پر ہاتھ مار کر) یا اللہ خیر، دیکھوں اب کیا گل کھلتا ہے،

جواں بخت۔ جی ہاں، تو کیا ہوا! —— کیا آپ لڑنے سے انکار کر دیں گی؟
میری یہ خوشی پوری نہیں کریں گی؟

فرخ سلطان۔ (ہنسکر) کچھ دیوانہ ہوا ہے لڑکے، —— یہ لڑیں گے، اور وہ بھی
مجھ سے، میں نہیں لڑتی، —— لیکن آخر بات کیا ہے؟ کیوں لڑنا چاہتے ہو؟

جواں بخت۔ اس لئے کہ آپ نے میری توہین کی!

فرخ سلطان۔ میں نے! —— یہ آج تم بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ میں
نے تمہارے برادر بزرگ صاحب عالم مرزا مغل کی تو کبھی توہین کی نہیں سنا کو
یہ عزّت بخشی کہ لڑتی، پھر تم کیا چیز ہو؟

جواں بخت۔ صاحب عالم مرزا مغل سے لڑنے اور ان کی توہین کا تو آپ کو پورا پورا
حق ہے۔ اگر آپ ایسا کرینگی تو مجھے خوشی ہوگی۔ بلکہ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔
لیکن اپنے ساتھ اس گستاخی کی اجازت نہیں دے سکتا!

فرخ سلطان۔ پھر وہی دیوانہ پن کی باتیں —— آخر کیا کیا میں نے؟ کچھ کہو بھی تو!

جواں بخت۔ اس دن آپ نے پکوان سے محروم رکھا۔ پھر جب میں جی بہلانے کے
لئے جھولے پر جا بیٹھا، تو آپ خواص کو حکم دیا کہ جا کر مجھے اُتار دے آپ
—— کو کرنا چاہیئے تھا یہ؟ آپ مجھے سمجھتی کیا ہیں!

فرخ سلطان۔ سمجھتی ہوں کہ تم جواں بخت ہو اور اب نصیب دشمناں پاگل ہوتے
جاتے ہو!

جواں بخت۔ یہ ہے جواب آپ کے پاس میری توہین و تذلیل کا؟

فرخ سلطان۔ اچھا اگر میں نے تمہاری توہین کی تو تم نے اس سے بڑھ کر میری تذلیل
کر ڈالی —— اُترے نئے جھولے سے؟

جواں بخت۔ کیا خوب —— یعنی خود اپنے ہاتھوں بھی اپنے آپ کو ذلیل کرتا!

نے الگ الگ جواب دے دیا۔

جواں بخت۔ اچھا ـــــ تو گویا نوک جھونک یہی ہے ہم میں اور آپ میں ـــــ ہونا ہی چاہیئے، آخر دیور اور بھاوج میں نوک جھونک نہ ہو گی تو کیا میاں بیوی میں ہو گی؟

فرخ سلطان۔ پھر وہی بے تکی باتیں شروع کر دیں ـــــ اچھا یہ بتاؤ جتنے سوالات تمہارے دماغ میں گھوم رہے تھے، سب پورے ہو گئے؟ یا ابھی باقی ہے کچھ؟

جواں بخت۔ دو ایک باتیں اور دریافت کرنی ہیں!

فرخ سلطان۔ دو ایک نہیں، دس بیس پوچھو، لیکن کشور کے بارے میں اب کچھ نہ پوچھنا۔ وہ بڑی نیک اور پاک لڑکی ہے۔ میں اسے زیر بحث لانا نہیں چاہتی!

جواں بخت۔ ہم بھی تو نیک اور پاک ہیں، براہِ کرم ان سے کہہ دیجئے گا، ہم کو بھی زیر بحث نہ لایا کریں۔

فرخ سلطان۔ (حیران ہو کر) یہ تم کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟

جواں بخت۔ وہی آپ کی نیک اور پاک دوست جو ہیں، کشور آرا بیگم ان کے بارے میں، اور کس کے بارے میں!

فرخ سلطان۔ کشور تمہیں زیر بحث لاتی ہے، وہ تم سے ملاقات کی کوشش کرتی ہے! وہ تم سے غیر ضروری باتیں کرتی ہے؟

جواں بخت۔ جی وہی، اور کون؟ میں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں انہیں!

فرخ سلطان۔ (پریشان ہو کر) ہائے اللہ، یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے!

——— پوچھو کیا پوچھ رہے تھے؟

جواں بخت۔ جب اس لڑکی سے آپ کی اتنی دوستی ہے تو ضرور صاحب عالم مرزا مغل سے اور اس کے شوہر سے بھی بڑی گاڑھی چھنتی ہوگی ——— کیا کرتا ہے وہ؟

فرخ سلطان۔ دھنیکہ! کیسی کیسی دُور کی کوڑیاں لاتے ہو تم بھی! بھلا اس غریب کی شادی کہاں ہوئی ہے ابھی؟

جواں بخت۔ شادی نہیں ہوئی تو منگنی ہو چکی ہوگی، بتایئے اس کا منگیتر کون ہے؟

فرخ سلطان۔ کیوں بیٹا میں نہیں بتاتے، تمہیں یہ باتیں دریافت کرنے کا حق کیا ہے؟ بڑے آئے کہیں کے!

جواں بخت۔ اتنی ساری باتیں آپ نے کر ڈالیں مگر اس کا نام تک تو بتایا نہیں!

فرخ سلطان۔ نام ہے کشور آرا ——— آگے چلئے اور کچھ پوچھئے۔

جواں بخت۔ نام تو اچھا ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہے کچھ؟

فرخ سلطان۔ اتنی زیادہ کہ تمہیں پڑھا دے ——— اور؟

جواں بخت۔ مزاج کیسا ہے؟

فرخ سلطان۔ انگارے کی طرح گرم!

جواں بخت۔ طبیعت کیسی ہے؟

فرخ سلطان۔ پھول کی طرح گرم شگفتہ

جواں بخت۔ واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کسی آدمی کا مزاج، تو انگارے کی طرح گرم اور طبیعت پھول کی طرح شگفتہ ہو آپ کے نزدیک مزاج اور طبیعت میں کچھ فرق ہے؟

فرخ سلطان۔ میرے نزدیک تو نہیں ہے، تم نے یہ باتیں الگ الگ پوچھیں ہیں

جواں بخت ۔ عالمِ خیال میں پہنچنے کے لئے چلنے پھرنے، کسی کو دھوکا دینے اور لوگوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کیا ضرورت ہے ؟

فرخ سلطان ۔ تو وہ عالمِ خیال میں تمہارے پاس آیا کرتی ہے ؟

جواں بخت ۔ ہاں اور کیا! ـــــ ہر وقت ہر جگہ حتیٰ کہ یہاں بھی،،!

فرخ سلطان ۔ جواں بخت کو عارفانہ نظروں سے گھور کر) اور میں سمجھی، ضرور تم محبّت کرتے ہو اس سے، ـــــ ہے نا ؟

جواں بخت ۔ بڑی کند ذہن ہیں آپ، اتنی دیر میں جا کر سمجھیں ـــــ ہاں میں آپ کی کشور سے محبّت کرنے لگا ہوں!

یہ سُن کر فرخ سلطان کھل کھلا کر ہنس پڑی، اس نے پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگائی اور کہا ۔

"بڑے مورکھ ہو، پریشان کر دیا تم نے آج ہمیں!"

وہ بولا :۔ لیکن آپ کے سوا خدا کی اس وسیع و عریض دُنیا میں اور ہے کون کہ اس کے سامنے اتنی بے تکلفی سے ماجرائے دل بیان کر سکوں؟ اور میں تو شاید اب بھی نہ کہتا، لیکن امّی حضور تلی ہیں، کہ شادی جلد از جلد ہونی چاہیئے، البتہ انہوں نے از راہِ کرم مجھے حق دیا ہے کہ اگر کوئی جگہ پسند کرتا ہوں تو وہ اسے ترجیح دیں گی، اب یہ آپ کا کام ہے، میری طرف سے پیغام امّی حضور کے پاس پہنچائیں، اور انہیں آمادہ کریں، کہ وہ کشور کو اپنی بہو بنالیں، آپ کا کہنا وہ مان جائیں گی،،!

بڑے فکرمند لہجہ میں فرخ سلطان نے کہا،،!

"بہت مشکل ہے، ـــــ کچھ جانتے بھی ہو کشور کس خاندان کی لڑکی ہے؟ اس کے باپ کا نام تہوّر حسین ہے!"

بے ساختہ جواں بخت کے مُنہ سے نکلا :۔ تہوّر حسین ـــــ ؟"

جواں بخت۔ ہو رہا ہے! سکنے کا کیا سوال؟

فرخ سلطان۔ دیکھو اب ایسی باتیں کسی کے سامنے نہ کرنا، وہ بڑی غیرت مند اور عفت مآب لڑکی ہے، اس کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی، تو زہر کھا کر مر جائیگی!

جواں بخت۔ تو پھر ان کاموں سے روکئے، جو جیسا کرے گا ویسا ہی کہا جائے گا، یہی دُنیا کی ریت ہے!

فرخ سلطان۔ میں ہرگز یقین نہیں کر سکتی، تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ اتنی نیک ہے کہ فرشتے اس کے دامن پر نماز پڑھیں، اس میں اتنی آن ہے کہ اگر وہ واقعی کسی سے محبّت بھی کرنے لگے، تو مرتے مرتے مر جائے گی مگر کیا مجال ہے جو دل کی بات زبان پر آجائے۔

جواں بخت۔ ٹھیک ہے آپ کا ایک ایک حرف صحیح ہو گا لیکن اتنا کرم کیجئے کہ یہ پیام انہیں پہنچا دیجئے کہ مجھے، میں ان کے تعاقب سے عاجز آگیا ہوں کسی اور پر نظرِ کرم کریں، دُنیا آدمیوں سے بھری پڑی ہے!

فرخ سلطان۔ دغور سے یہ باتیں سنتے ہوئے) میں ہرگز اس سے کچھ نہیں کہوں گی تم جھوٹے ہو!

جواں بخت۔ اچھا ان سے نہ کہئے مجھی کو کوئی ترکیب گلو خلاصی کی بتا دیجئے!

فرخ سلطان۔ کاہے کی ترکیب بتاؤں؟

جواں بخت۔ آخر کس طرح اس مصیبت سے نجات پاؤں؟

فرخ سلطان۔ اب جب آئے تو دھتکار دینا نہ ملنا،

جواں بخت۔ بہت کوشش کی لیکن بے نتیجہ ——

فرخ سلطان۔ آخر گھر بھر کو دھوکا دے کر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح وہ تمہارے پاس آجاتی ہے؟

کشور آرا

جوان بخت کی باتیں سن کر فرخ سلطان سوچ میں پڑ گئی ! !

یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی؟ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

واقعی، جواں بخت ایسا مجموعۂ اوصاف تھا کہ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اسے اپنا داماد بنانا باعث فخر و امتیاز سمجھ سکتی تھی، وہ کون سی خوبی تھی جو اس میں نہ تھی! خاندان کا جہاں تک تعلق تھا، بہادر شاہ بادشاہ ہند کا فرزند دلپسند، دولت و امارت اس کی کنیز، وجاہت و شرافت جلو بردار، وقار و تمکنت اس کا شعار، لیکن کیا تہور حسین بھی اسے اپنا داماد بنانے پر راضی ہو سکیں گے؟ اس سوال کا جواب مشکل تھا، وہ عجیب کینڈے کے آدمی تھے، بھلا جو شخص بھرے دربار میں، جہاں پناہ کو مخاطب کر کے، جواں بخت اور زینت محل کی موجودگی میں بے دھڑک کہہ دے کہ ولی عہدی مرزا قویاش کا حق ہے، جواں بخت کا نہیں، اسے بھی کسی خلاف مرضی بات پر راضی کیا جا سکتا ہے؟ اول تو ان کی موجودہ روش کو دیکھتے خود یہ مشکل ہے۔ کہ جہاں پناہ، اور ملکہ معظمہ اس رشتہ کی تائید کریں، لیکن خوش قسمتی سے دونوں جواں بخت کو بہت زیادہ چاہتے ہیں، اونچ نیچ سمجھانے سے، ممکن ہے ماںتا، اور محبت پدری سے مجبور ہو کر راضی ہو جائیں، اس لئے کہ کشور آرا کا جہاں تک تعلق ہے، اسے خود ملکہ بھی بہت مانتی اور چاہتی ہیں، لیکن حضرت تہور حسین صاحب نے اگر جلال میں

فرخ سلطان نے کہا،۔
ہاں، لیکن اچھا ——— تم فکر نہ کرو، میں زندہ ہوں تو یہ بیڑہ ضرور پار لگے گا!"
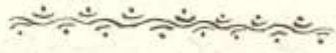
ہوں، صاحب عالم مرزا مغل مجھ پر دسترس نہیں حاصل کر سکیں گے۔

ارے ہاں خوب یاد آیا تہور حسین سے پہلے بھی تو ایک منزل سر کرنی ہے خود بیگم صاحبہ یعنی کشور آرا کب کسی سے کم ہیں، یہ بھی تو ممکن ہے تہور حسین کسی طرح راضی ہو جائیں، اور بی کشور اَڑ جائیں "ہم تو نہیں کرتے شادی" یہ ڈر یوں بھی لگتا ہے۔ کہ وہ طبعاً، دولت و امارت، اور شاہی ٹھاٹھ باٹھ سے، کچھ بیزار اور متنفر سی نظر آتی ہے، خود سادہ زندگی بسر کرتی ہے، اور جس کو ضرورت سے زیادہ عیش و نعمت کی زندگی بسر کرتے دیکھتی ہے، اس پر طنز کرتی ہے، ڈاکو اور لٹیرا کہتی ہے بھلا اس خیال کی لڑکی کسی کے قابو میں آسکتی ہے؟

——— پھر باپ کی تو رِ نظر ممکن ہی نہیں کہ تہور حسین اس کی مرضی کے خلاف بیاہ دیں۔

کیوں نہ کشور کو پرجانے کی کوشش کی جائے، ہاں یہ ٹھیک ہے وہ اگر شیشہ میں اُتر گئی تو منزل کا سر کانا بہت آسان ہو جائے گا، پھر تہور حسین اپنی مرضی کے خلاف بھی، یہ پیام منظور کر لیں گے۔

بس یہ ٹھیک ہے! ——— میں وہاں جاتی ہوں، باتوں باتوں میں اس کا دل ٹٹولونگی، اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرونگی، امید تو ہے قابو میں آ جائے گی۔

فرخ سلطان نے اپنی خواص نوبہار کو بلایا اور اس سے کہا۔

"بہت دن ہوئے کشور سے ملاقات نہیں ہوئی، جی چاہتا ہے اس سے ملنے کا نوبہار نے جواب دیا، "اگر حضور کی مرضی ہو تو بندی جائے، اور انہیں اپنے ساتھ لے آئے!"

فرخ سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، اور اگر وہ نہ آئی؟ کوئی عذر کر دیا،

یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو کیا ہوگا؟ کیا تاجِ خسروی، اور تختِ شاہی اور وقار و سطوتِ تیموری کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی توہین ہو سکتی ہے؟ نا بابا، اس معاملہ میں ہاتھ ڈالنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں، تیور جیبن سے کچھ بھی بعید نہیں، جب کہ جواں بخت سے ان کا دل بھی صاف نہیں ہے، وہ علانیہ طور پہ، مرزا قویاش کے حامیوں اور طرفداروں میں ہیں، یہ جواں بخت بھی کتنا بے وقوف ہے، حضرت عاشق بھی ہوئے تو کس پر، کشور پہ، جس کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ دشوار اور کٹھن ہے

یہ باتیں دل ہی میں سوچ کر فرخ سلطان نے فیصلہ کر لیا کہ اس معاملہ میں ہاتھ نہیں ڈالے گی، یہ تو یہ کوئلوں کی دلالی ہوئی کہ ہاتھ بھی کالے اور منہ بھی -

لیکن یک بیک اس کے سامنے جواں بخت کی تصویر پھر گئی،!

وہی شوخ و شنگ، تیرو طرار، ہنس مکھ، اور سجیلا جوان، جس کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے، جس کی باتوں میں شراب کا نشہ تھا، جو محفل میں اپنی نواسنجیوں سے ایک نیا سماں، ایک نیا کیف پیدا کر دیتا تھا۔ اسے قلعہ کی اس وسیع دُنیا میں میرے سوا کوئی نہ ملا جس سے اپنے دل کا حال کہتا، جسے وہ اپنے راز کا معتمد اور امین بناتا جس کے سامنے بے جھجک اقرارِ محبت کر سکتا، کتنے داعیہ سے آیا تھا میرے پاس، کتنے پہلو بدل کر حرفِ مطلب لایا تھا زبان پر، اقرارِ محبت کرتے وقت کیسی رنگت ہو گئی تھی، اس کے چہرۂ زیبا کی، اگر میں بھی پیچھے ہٹ گئی، اگر میں نے بھی اس کی مدد نہ کی، تو کرے گا بیچارہ؟ پھر کس کے پاس جائے گا، کس سے مشورہ اور مدد کا طالب ہوگا؟ نہیں میں اسے مایوس نہیں کر سکتی، میں اسے رنجیدہ اور مغموم نہیں دیکھ سکتی، یہ نہیں ہو کہ ہم دونوں (فرخ اور مرزا مغل) نشاطِ زندگی سے ہمکنار ہوں، اور جواں بخت حسرت و نامرادی کی زندگی بسر کرے، میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس ناؤ کو پار لگانے کی کوشش کرونگی، جب تک جواں بخت کی شادی کشور سے نہیں ہو جاتی عہد کرتی

فرّخ کی زبانی!

آج یک بیک بے سان وگمان، اور بغیر کسی اطلاع کے وفعتہً فرخ سلطان جو کشور آرا کے پہنچی، تو سب ہی کو حیرت آمیز مسرت ہوئی، کشور تو اس کے گلے سے لپٹ گئی، اس نے بڑے چاؤ سے پوچھا:-

کہاں بھُول پڑیں، ــــــ کہیں اور جارہی ہوں گی، راستے میں ہمارا گھر پڑا سوچا چلو کشور کے سر پر بھی احسان کا گٹھر رکھتے چلیں، ۔ کیوں یہی بات ہے نا؟

فرخ سلطان:- توبہ کرو کشور، ــــــ کتنی بدگمان رہتی ہو ہم سے قسم لے لو، جو تمہارے گھر کے سوا کہیں اور جانے کا ارادہ بھی کیا ہو ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ہمارا آنا تمہیں ناگوار گذرا ہو، !

کشور آرا:- (ہنس کر) جی بے شک، آپ ہی کا آنا تو ناگوار گذرے گا، جس سے محبّت ہوتی ہے واقعی اس کا آنا ناگوار گذرتا ہے۔ اس سے تو آپ انکار نہیں کرسکیں کہ یہ خاکسار آپ سے محبّت کرتی ہے۔

فرخ سلطان:- اور خاکسار کو بھی آپ کی صداقت اور حق پسندی سے امید ہے کہ میری آفتاب کی سی چمکدار محبّت والفت سے انکار نہیں کریں گی آپ،

کشور آرا:- شکریہ اس عزت افزائی اور بندہ نوازی کا، لیکن ایک بات تو بتائیے، یہ خالی خولی عشق ومحبّت کے پینگ کب تک بڑھتے رہیں گے، شادی کب

اس نے ؟ یا پدر بزرگوار تہور حسین صاحب نے کچھ مین میخ نکالی، تو کیا ہوگا ؟"

نوبہار نے کہا" نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، بھلا یہ ممکن ہے کہ آپ بلائیں، وہ نہ آئیں ؟ وہ آپ کو بہت مانتی ہیں، سارے قلعہ میں کہیں بھی نہیں جاتیں، اگر کہیں آنا جانا ہے تو صرف آپ کے پاس۔ کیسے ممکن ہے کہ انکار کر دیں ——

فرخ سلطان نے نوبہار کی باتیں سن کر کہا، !

" ہاں تیرا خیال ٹھیک ہے، لیکن کچھ دیر کے لئے ہم بھی ذرا آب و ہوا بدلنا چاہتے ہیں، ہم خود جائیں گے وہاں !"

وہ بڑی آمادگی کے ساتھ گویا ہوئی۔

" بہت خوب لونڈی ابھی سواری کا انتظام کرتی ہے !"
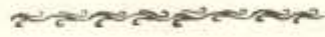
کشور آرا۔ (سنجیدگی سے) تو اس میں رکاوٹ کیا ہے، بھلا بادشاہوں اور شہزادوں کے راستہ میں کیا مشکل پیش آسکتی ہے، جس سے چاہیں، جب چاہیں، دن کی روشنی میں، رات کی تاریکی میں، بھری محفل میں یا کسی ویرانہ میں، شادی کر لیں، نہ دولت کی کمی، نہ وسائل و ذرائع کی کمی، صرف ایک اشارہ کی دیر ہے!

فرخ سلطان۔ ہاں یہ سچ ہے، لیکن کیا تم جواں بخت کے بارے میں بھی یہی رائے رکھتی ہو؟

کشور آرا۔ ان کے بارے میں تو کوئی رائے نہیں رکھتی، کسی آدمی کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھتی، میں نے تو یونہی ایک عام بات کہہ دی تھی!

فرخ سلطان۔ کیا تم نہیں جانتیں، وہ کتنا نیک، کتنا صالح اور کتنا اچھا آدمی ہے؟

کشور آرا۔ (مسکرا کر) جانتی تو نہیں، ہاں سنا ضرور ہے!

فرخ سلطان۔ پھول والوں کے میلہ میں اسے دیکھ بھی تو چکی ہو!

کشور آرا۔ ہاں، میں جرم کا اقرار کرتی ہوں!

فرخ سلطان۔ تو اب جرم کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ، کسی طرح بھی معافی نہیں مل سکتی!

کشور آرا۔ آپ کی یادگار سے جو سزا بھی ملے بسر و چشم منظور ہے!

فرخ سلطان۔ تو سزا یہ ہے کہ تمہیں جواں بخت سے شادی کرنا پڑے گی!

کشور آرا۔ (ہنستے ہوئے) اگر ایک مرتبہ دیکھ لینے کی یہ سزا ہے۔ تو پھر ان بیچاریوں کو حشر کیا ہوگا، جو انہیں بار بار دیکھتی رہتی ہیں، نہ صرف دیکھتی رہتی ہیں، بلکہ باتیں بھی کرتی ہیں، ہنسی دل لگی بھی کرتی ہیں؟ لوگ بھونک بھی کرتی ہیں، میں نے

ہو گی؟ میں نے تو سُنا تھا، بہت جلد ہونے والی ہے، اور صاحب عالم مچلے ہوئے ہیں کہ جلد از جلد یہ تقریب خوبی اور خوش اسلوبی سے سا تھ تمام کو پہنچ جائے۔

فرخ سلطان۔ (سنجیدہ ہو کر) تم نے سچ سُنا ہے لیکن، اب شاید تاخیر ہو، ——— بلکہ شاید یہ تقریب ہی سرے سے ملتوی ہو جائے ———!

کشور آرا۔ (پریشان ہو کر) ہائیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟ خدا نخواستہ کیا بات ہوئی؟ کچھ جھگڑا ہو گیا تم دونوں میں؟

فرخ سلطان۔ نہیں ——— ہو ہی نہیں سکتا، بھلا محبّت میں کہیں جھگڑا ہوتا ہے؟ اور ہو بھی تو اِدھر ہُوا، اُدھر ختم!

کشور آرا۔ تو کیا جہاں پناہ نے رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا؟

فرخ سلطان۔ نہیں یہ بات بھی نہیں ہے۔!

کشور آرا۔ پھر کیا بات ہے خدا کی بندی! میں تو سہمی جا رہی ہوں۔ کچھ معلوم تو ہو۔

فرخ سلطان۔ خود میرا ایک عہد آڑے آ رہا ہے۔

کشور آرا۔ آپ کا عہد؟ یعنی آپ نے عہد کیا ہے کہ صاحبِ عالم سے شادی نہیں کریں گی؟ یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی؟

فرخ سلطان۔ ہاں کشور! آدمی اگر شریف ہے تو قول و قرار سے مجبور ہوتا ہے عہد کر چکی ہوں کہ جب تک جواں بخت کی شادی نہیں ہو جاتی، میں بھی نہیں کروں گی!

کشور آرا۔ (مسکرا کر) چاہے ساری عمر بیت جائے۔

فرخ سلطان۔ (ایک عزم کے ساتھ) ہاں ——— یہ میرا عہد ہے!

کشور میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، غور سے اور توجہ سے سنو اور میرے سوال کا جواب دو"!

فرخ کے ان سنجیدہ الفاظ نے کشور کو بھی سنجیدہ بنا دیا اس نے کہا:۔

"میں غور اور توجہ سے سن رہی ہوں، اور جو سوال ہوگا اس کا جواب بھی دونگی، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ایسی کیا خاص بات ہے۔ جسے اتنی سنجیدگی سے آپ شروع کر رہی ہیں"!

فرخ نے جواب دیا:۔

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے، میرے اور تمہارے جو تعلقات ہیں، ان کے پیش نظر اگر یہ امید رکھوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ تم کسی بدگمانی یا غلط فہمی کا شکار نہیں ہوگی"!

کشور نے اُکتا کر جواب دیا!

"توبہ ہے بھئی، کہہ بھی چکئے کسی طرح"!

فرخ سلطان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"بات یہ ہے کہ اس روز وہی پھول والوں کے میلہ کے دن، جواں بخت نے تمہیں دیکھا تھا ——— اور وہ تم سے محبّت کرنے لگا، سارے محل میں ایک میں ہی اس کی راز دار اور معتمد ہوں، میرے سوا اور کس سے کہتا، شاید مجھ سے بھی اس راز کو چھپاتا، لیکن بات یہ ہوئی کہ ملکہ زینت محل، اس کی افسردگی، اضمحلال، اور پریشانی دیکھ کر تاڑ گئیں کہ لڑکا کہیں دل دے بیٹھا ہے، اگر ذرا غفلت کی گئی تو ہاتھ سے نکل جائے گا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔ یہ فیصلہ بجلی بن کر گرا بیچارے پر، لیکن ماں کا دل ماں کا دل ہوتا ہے۔ بلکہ اس نے اس کی کیفیت بھانپ لی، موقع دیا کہ گو وہ خود کہیں شادی کرنا چاہتا ہو تو

صرف ایک مرتبہ شہزادے صاحب کو دیکھا، اور اتنی بڑی گنہگار قرار پائی
کہ ان سے بطور سزا کے شادی کرنا پڑے گی،!

فرخ سلطان۔ ہاں بے شک،!

کشور آرا۔ لیکن ارشاد ہو کہ جو خواتین والا شان ان سے خلا ملا رکھتی ہیں، اور ان سے بات چیت کرتی ہیں ہنسی مذاق کرتی ہیں، چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں، ان کے ساتھ جھولا جھولتی ہیں، آخر انہیں کیا سزا ملے گی؟ وہ تو شاید شادی سے بھی زیادہ کوئی عبرتناک سزا ہو گی؟

فرخ سلطان۔ (مسکرا کر) بڑی شریر ہو، یہ مجھ پر چوٹ کر رہی ہو، ارے میرا تو وہ دیور ہے، میرے لئے تو سب کچھ جائز ہے ——

کشور آرا۔ جب آپ کے لئے سب کچھ جائز ہے، تو مبارک، پھر دوسروں کے لئے رہا کیا؟

فرخ سلطان۔ کشور تمہیں جوان بخت پسند بھی آیا؟

یہ سنکر دفعۃً کشور کا رنگ رُخ بدل گیا چہرہ پر سُرخی سی دوڑ گئی، کان کی لوئیں تمتما گئیں، کچھ جھینپ سی گئی وہ، لیکن بہت جلد اپنی کیفیت پر غالب آ گئی، اس نے پہلو بدل کر جواب دیتے ہوئے کہا۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی کیا کسی شریف خاندان کی لڑکی، جب بقول آپکے کسی شریف، صالح، اور پاکباز نوجوان کو دیکھتی ہے تو اپنی شرافت کا ثبوت یوں دیتی ہے کہ اسے پسند یا ناپسند کرنے بیٹھ جاتی ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات کہی آپ نے؟

کشور کے ان الفاظ کا تیکھا پن فرخ نے محسوس کیا، اور بات بگڑتی دیکھ کر فیصلہ کر دیا کہ یا بات بن جائے گی، ورنہ پھر ٹوٹ ہی جائے گی، اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا!

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

کشور آرا نے فرخ سلطان کی ساری باتیں خاموشی کے ساتھ سُن لیں، مگر کوئی جواب نہ دے سکی، گُم سم بیٹھی رہی،!

یہ باتیں خلافِ توقع بھی تھیں، حیرت انگیز بھی، اور مایۂ صد نشاط و مسرت بھی، اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ جواں بخت کی بیوی بن سکتی ہے اور اس کا تو وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی، کہ جواں بخت اس سے محبّت کر سکتا ہے لیکن خود اس کے دل کی کیا کیفیت تھی؟ جب سے اس نے جواں بخت کو دیکھا تھا، دل میں میٹھا میٹھا سا درد محسوس کر رہی تھی، اس نے پہلی مرتبہ جواں بخت کو دیکھا تھا لیکن یہ پہلی نظر دل سے جگر تک اُترتی چلی گئی۔

جواں بخت کی بے ساختہ آمد، اس کا دل آویز تبسّم، اس کی دلچسپ اور پُر لطف باتیں، اس کی شوخی اور بذلہ سنجی، اس کی تیزی اور شرارت، یہ سب چیزیں اس کے دل پر نقش ہو گئیں، اس نے جواں بخت سے آنکھیں چار نہیں کی تھیں، اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا، اس سے بات چیت بھی نہیں کی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے اس کی تصویر صفحۂ دل پر نقش ہو گئی، اور اب مٹائے نہیں مٹتی تھی، ہر مرتبہ جب جواں بخت یاد آتا تھا۔ وہ اپنا خیال بدلنے کی کوشش کرتی تھی، دوسری باتیں سوچنے لگتی تھی، دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتی تھی، دوسروں سے خواہ مخواہ کی باتیں

اس جگہ کو ترجیح دی جائے گی، لیکن شادی اب نہیں ٹل سکتی۔ بیچارہ بھاگوں بھاگ میرے پاس آیا۔ "مُلا کی دوڑ مسجد تک" کہنے لگا، اگر میری زندگی بچا سکتی ہو تو بچا لو، میں بھلا تم جیسی بقراط کے بارے میں اپنی طرف سے کیا کہہ سکتی تھی، میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور سیدھی تمہارے پاس چلی آئی، جو کہو وہ کہہ دوں۔ بیاکر اس دل گرفتہ سے۔!

~~~
~~~

ابھی کل ہی کی تو بات ہے میں سونے کے لئے بستر پر لیٹی تھی، کہ جواں بخت کی یاد آنکھوں میں آبسی، اور نیند اُڑ گئی۔ آنکھیں بند تھیں۔ بظاہر سو رہی تھی، لیکن حقیقتاً عالم خیال کی سیر کر رہی تھی، کہ ابا جانی اور اماں حضور میں باتیں شروع ہوئیں نہ جانے طرح مرزا قویاش کا ذکر چھیڑا، تو انہوں نے فرمایا:-

مرزا قویاش سے جتنی امیدیں تھیں، سب خاک میں مل گئیں، ان کے لچھن خاندان، تیموری کو لے ڈوبیں گے، ایسے شرائط پر ولی عہدی قبول کر لی، اور اس طرح خود، اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ لے دے کے اس خاندان میں جواں بخت ہے جو لوگوں کی امید و آرزو کا مرکز ہے، خدا اسے عمر خضر عطا کرے اور صحیح معنوں میں تیموری ناموس کا محافظ و امین بنا دے،!

اس پر اماں حضور نے ابا جانی کو ٹوکا،!

"آج یہ کہہ رہے ہیں، اور کل تک، آپ سے بڑھ کر، جواں بخت کا مخالف اور قویاش کا حامی و ہمدرد کوئی نہیں تھا،!

اس کے جواب میں ابا جانی نے کہا،!

"ہاں یہ میری غلطی تھی، میں محسوس کرتا ہوں، میں نے غلط آدمی کا ساتھ دیا تھا، جہاں پناہ مجھ سے اب تک کھچے ہوئے ہیں، لیکن میں ان کی خوشامد نہیں کر سکتا، وہ رائے میں نے اس لئے نہیں قائم کی تھی کہ وہ خفا ہوں، اور یہ رائے اس لئے نہیں ہے، کہ وہ خوش ہو جائیں،!

بڑی دیر تک ابا جانی اور اماں حضور میں اس طرح کی باتیں ہوتی رہی، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی اور میں سو گئی،!

——— تو ابا جانی کی رائے اب بدل چکی ہے،

وہ اب جواں بخت کی تعریف کرنے میں اسے قابل توصیف سمجھتے ہیں،!

رنے لگی تھی۔ کوئی کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگتی، لیکن جتنا جتنا اسے بھلانے کی کوشش کرتی۔ اتنا اتنا وہ یاد آتا تھا، اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی، اس کیفیت کے سامنے وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ بے بس پاتی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کرے؟ کوئی راز دار نہیں تھا، دمساز نہیں تھا، کسی کو اپنے راز کا امین نہیں بنا سکتی تھی، لے دے کے ایک فرخ سلطان تھی، لیکن یہ بات ایسی تھی کہ فرخ سلطان سے کہتے ہوئے بھی ہچکچاتی تھی!

آخر کیا کہوں اس سے؟

کیا یہ کہ میں جواں بخت سے محبت کرتی ہوں؟

کیا رائے قائم کرے گی وہ میرے بارے میں؟

پھر بھلا اس سے آنکھیں چار کر سکوں گی میں؟ ——

پھر پھٹ جائے اور میں سما جاؤں، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ میں اپنا وقار بیچ کر، جواں بخت کا سودا کروں؟ وہ شہزادے ہیں، جہاں پناہ کے فرزند دلبند، لیکن میں بھی تو بہت کچھ ہوں۔ کشور آرا، تہور حسین کی بیٹی ہے یہ ممکن ہے کہ گھن کی طرح مجھے چاٹ لے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ، راز محبت آشکارا کر دوں۔

سب سے کڑا مرحلہ ابا جانی کا ہے، اس روز ملکہ زینت محل نے طعنہ دیا تھا، کہ تمہارے ابا ہم سے خفا رہتے ہیں اور سچ پوچھو تو یہ طعنہ بے جا بھی نہیں، سب جانتے ہیں ابا جانی، صاحب عالم مرزا قویاش کے حامیوں اور طرفداروں میں ہیں فرخ بھی اس دن یہی کہہ رہی تھی، اور ایک فرخ کیا ساری دنیا یہی کہتی اور سمجھتی ہے، کس کس کا منہ بند کر سکتی ہوں! کس کس کو روک سکتی ہوں؟ اور سچی بات چھپانے سے حاصل کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ ابا جانی جواں بخت کے مقابلہ میں قویاش کو ترجیح دیتے ہیں

لیکن نہیں ——

نہیں سکتی،!

کشور آرا. لیکن میں تو اس زبان سے بالکل ناواقف ہوں،

فرخ سلطان. اچھا تو جس زبان سے تم واقف ہو، اس زبان میں کروں گی، بتاؤ وہ زبان کون سی ہے؟

کشور آرا. خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری۔

فرخ سلطان. آخر آگئیں رستے پر، شاعری کی زبان میں گفتگو کرنے لگیں اور کھیل کھیلو گی دو چار ملاقاتوں میں،!

کشور آرا. جی منہ دھو رکھئے، کھیل کھیلنے والے کوئی اور ہوں گے،!

فرخ سلطان. ارے بے وقوف لڑکی تو خواہ مخواہ مجھے دوسری باتوں میں الجھا رہی ہے، میں تیرا عندیہ لینے آئی ہوں۔ بتا کیا کہوں جا کر اس عاشق نامراد سے،؟

کشور آرا. (مسکرا کر) جو آپ نے صاحب عالم مرزا مغل بہادر سے کہا تھا، یہ کہہ کر کشور آرا مسکرانے لگی، فرخ سلطان نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ اور کہا۔

"تو سمجھ گئی، تم بھی محبت کرتی ہو اس سے،!"

کشور آرا. آپ اگر غلط فہمی میں مبتلا ہوں تو کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن خدا کے کسی اور کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دیجئے گا، اور اگر ایسا کیا تو واقعی ذمہ داری آپ ہی پر ہوگی، یہ کہے دیتی ہوں،

فرخ سلطان. یعنی تم جواں بخت سے نفرت کرتی ہو،؟

کشور آرا. (بے ساختگی سے) خدا نہ کرے ـــــ میں کسی سے نفرت نہیں کرتی!

فرخ سلطان. تو پھر اقرار کرو کہ محبت کرتی ہو،!

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟

بات جہاں تھی وہیں رہے گی، جہاں پناہ ان سے بدستور بدظن ہیں، ملکۂ زینت
محل بھی بدگمان ہیں، خود شہزادہ جواں بخت تو شاید سب سے زیادہ **خفا** اور برہم
ہیں، بھلا ایسے شخص کی لڑکی کو وہ قابل اعتماد سمجھ سکتے ہیں؟

نہیں میری محبت پروان نہیں چڑھ سکتی، یہ ناؤ ساحل امید تک نہیں پہنچے گی۔

لیکن آج جب فرخ سلطان آئی اور اس نے جواں بخت کی داستانِ محبت
سنائی تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا وہ سمجھی فرخ اس سے مذاق کر رہی ہے
لیکن وہ اس کی کس کس بات کو جھٹلاتی، اور پھر آدمی کا اندازہ ان کے دل اور نیت کی
غمازی کر دیتا ہے، فرخ جھوٹ نہیں بول سکتی اور مجھ سے تو کسی طرح نہیں بول سکتی!

اس طرح خاموشی سے بیٹھے بیٹھے بڑی دیر ہو گئی، آخر فرخ سلطان نے قفل سکوت توڑا،

فرخ سلطان۔ کشور تم اس طرح خاموش ہو جیسے خدانخواستہ بولنا ہی نہیں آتا،
میری بگو اس اتنی دیر تک سنتی رہی، کچھ تو جواب دو!

کشور آرا۔ کیا جواب دوں؟

فرخ سلطان۔ یہ بھی میں بتاؤں؟

کشور آرا۔ تو پھر مجھے خاموش رہنے دو!

فرخ سلطان۔ میری بہن، جواں بخت بے پناہ محبت کرتا ہے تجھ سے، جان دیتا
ہے تجھ پر، اور تجھ سے شادی کرنے کی آرزو رکھتا ہے، فقیر تیرے در پر آیا ہے۔
بتا اس کی جھولی میں کیا ڈالے گی؟ ——— اقرار کا پھول یا انکار
کا کانٹا؟

کشور آرا۔ آج تو آپ بڑے شاعرانہ رنگ میں باتیں کر رہی ہیں،

فرخ سلطان۔ ہاں محبت کی زبان بڑی نازک ہوتی ہے، وہ کسی اور لہجہ کی متحمل ہو ہی

ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں ـــ نہ ٹھہرے گا!

انگریز اب کھل کھیلے تھے، طاقت اور اقتدار نے ان میں نخوت اور پندار کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، نہ وہ بادشاہ کو خاطر میں لاتے تھے نہ رعایا کو، وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا مالک سمجھنے لگے تھے، انہوں نے فرانسیسیوں کا ولولہ ختم کر دیا تھا، انہوں نے مرہٹوں کا زور توڑ دیا تھا، انہوں نے سکھوں کی طاقت کچل دی تھی، اور اب پنجاب کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن تھے، انہوں نے اودھ کا الحاق کر لیا تھا، اور دلی کے پڑوس میں اب کوئی با اقتدار حکومت باقی نہیں رہ گئی تھی، انہوں نے ہندوستان کے راہبروں اور ریاستوں پر واضح کر دیا تھا کہ جو ان کا نیاز مند ہے، وہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کرے گا، اور جو ان سے اُلجھے گا، اس کی نہ پگڑی سلامت نہ وجود، انہوں نے لال قلعہ کو بادشاہ سلامت کو، مرشد زادوں کو، شہزادوں کو، خاندان شاہی کے متوسلین کو، وزرا، اور اُمراء کو اس اپنے شکنجہ میں کس لیا تھا کہ یہ سب پورے طور پر گرفت میں آ گئے تھے، اور اب کسی مقابلہ اور مزاحمت کی تاب و طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی، انہوں نے فوجی طاقت اس حد تک بڑھا لی تھی کہ ہر ہنگامی حالت کا مقابلہ کر سکتے تھے، ہر فتنہ کا سر کچل سکتے تھے، ہر بغاوت کو فرو کر سکتے تھے، تاج شاہی اب تک انہوں نے اپنے سر پر نہیں رکھا تھا، لیکن ان کے ایک ہاتھ میں تختِ خسروی

کشور آرا۔ واہ یہ بھی اچھی رہی، یا تو کسی سے نفرت کرو، ورنہ محبت کرو، نفرت اور محبت کے علاوہ آپ کے ہاں کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے،؟

فرخ سلطان۔ نہیں —— اور ہم کہے دیتے ہیں کہ تم جوان بخت جیسے آدمی کی محبت نہیں ٹھکرا سکتیں، تمہیں اس سے محبت کرنی پڑے گی،!

کشور آرا۔ کیا محبت ڈنڈے کے زور سے بھی کی جاتی ہے؟

فرخ سلطان۔ ہاں —— کبھی کبھی خاص حالات میں،

کشور آرا۔ آپ کی محبت بھی ایسی ہے؟

فرخ سلطان۔ نہیں —— ہم دونوں کو تو ایک ساتھ محبت ہوئی تھی، ڈنڈے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا، تم چونکہ اکڑ رہی ہو، لہٰذا تمہاری اصلاح کی ضرورت ہے،!

کشور ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ فرخ سلطان کی آمد سن کر کشور کی امی حضور یہاں آگئیں، اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی،!

بس وہ بے کس تھا، کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوا آہ بھرنے کے، اور اشعار کی صورت درد دل کا ماجرا بیان کرنے کے، اس نے اپنے آپ کو مقدر کے حوالے کر دیا تھا، اور وہ جانتا تھا، تقدیر کا اٹل فیصلہ کیا ہے؟

لیکن کیا دلّی اور ہندوستان کے عوام بھی اس فیصلہ کے آگے سر جھکا چکے تھے واقعات کا جواب انکار میں ہے، ——!

بے شک دولت مند، اور خود اندیش لوگ، انگریزوں کے گن گا رہے تھے ان کے دامن دولت سے وابستگی کو اپنے لئے موجب فخر و ناز سمجھ رہے تھے لیکن عوام خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے، انہیں انگریزوں کی صورت بری لگتی تھی، وہ ان کے اخلاق کا مذاق اڑایا کرتے تھے، انگریز عورتوں کی بے حجابی انگریزوں کی بے باکانہ شراب نوشی، انگریز عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کے جو مناظر وہ دیکھتے تھے، وہ اس تہذیب و تربیت اور تعلیم کے یکسر خلاف تھے جو انہوں نے اپنے گھروں میں حاصل کی تھی۔

اور اب ایک نئی افواہ سارے شہر میں، اور شہر کے آس پاس کے باشندوں میں گشت کر رہی تھی۔

یہ کہ انگریز صرف، ہندوستان کی سلطنت پر قانع نہیں ہیں، وہ ہندوستان کا مذہب بھی بدل دینا چاہتے ہیں، وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو عیسائی بنا لینا چاہتے ہیں، خدمت خلق، ہسپتال، اسکول، اور تبلیغ —— کی صورت میں انہوں نے جو ڈھونگ رچا رکھا ہے اس کا مقصد صرف ایک یہ ہے، کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان عیسائی بنا لئے جائیں ——،

یہ بات قطعاً ناقابل برداشت تھی، مسلمان ہر چیز سے دستبردار ہو سکتے تھے لیکن اپنے مذہب سے دستبردار ہو جائیں، یہ گوارا نہ تھا، ہندو کہتے تھے ایک ہزار برس کے

تھا، اور دوسرے ہیں تاج قیصری، جسے چاہیں تخت پر بٹھادیں جس کے سر پہ چاہیں تاج رکھ دیں، جسے تخت نشین کردیں اسے اتار دینے کا، جسے ابدار کردیں اسے معزول کردینے کا حق انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا، سازشوں میں ہمیشہ سے تھے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس فن کے امام تھے، قلعہ کے اندر جتنی افراتفری مچی تھی جتنے خفیہ اور علانیہ جوڑ توڑ کئے جاتے تھے، ان میں انگریزوں کا ہاتھ تھا، وہ جس مہرے کو چاہتے آگے بڑھا دیتے، جسے چاہتے پیچھے ہٹا لیتے تھے خواہ وہ شہزادہ ہو یا وزیر یا بادشاہ کا مصاحب خاص، !

رعایا اپنی آنکھوں سے یہ زہرہ گداز اور روح فرسا واقعات دیکھتی تھی، اور خون پی کر رہ جاتی تھی،

سب بادشاہ پرست تھے، سب کو اپنے بادشاہ کی ذات سے غیر معمولی عقیدت تھی، وہ جب دیکھتے تھے کہ انگریزوں کا اثر بڑھتا جاتا ہے پرانی قدریں مٹ رہی ہیں اور نئی قدریں عالم وجود میں آرہی ہیں، پرانی بساط الٹ رہی ہے اور نئی بساط بچھائی جارہی ہے، پرانی تہذیب وتمدن اور وضعداری کا دور ختم ہو رہا ہے، اور نئی معاشرت نئی تہذیب، اور نئی ثقافت جنم لے رہی ہے، تو تلملا کر رہ جاتے تھے، بس نہیں چلتا تھا کہ انگریزوں کو ان کی لائی ہوئی تہذیب وتمدن کو، ان کی پیدا کی ہوئی معاشرت کو غارت کرکے رکھ دیں، خون کھول کر رہ جاتا تھا، غصہ سے چہرہ تمتما اٹھتا تھا، بدن پہ رعشہ طاری ہو جاتا تھا لیکن ——

ہائے مجبوری، !

اور قلعہ کے اندر مغلیہ خاندان کا نمائندہ —— بہادر شاہ —— ملول ومحزون مغموم وافسردہ بیٹھا نماز پڑھا کرتا اور وظائف میں مشغول رہتا تھا، وہ جانتا تھا کیا ہونے والا ہے، اور وہ دیکھ رہا تھا کیا ہو رہا ہے، لیکن وہ اپنے ملک کے عوام سے زیادہ بے

ہیں باریاب تھے، وفد باریاب ہُوا اور اس نے انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر لیا۔ جہاں پناہ نے شفقت اور اخلاق کے ساتھ باتیں سُنیں، اور فرمایا:۔
ہم نے آپ کی باتیں سُنیں، ہم آپ کے جذبہ کی قدر کرتے ہیں، جو کچھ آپ محسوس کر رہے ہیں، ہم بھی محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ معاملات ایسے نہیں ہیں، جن کو فوری طور پر تصفیہ کیا سکے،!

میروفد۔ جہاں پناہ ہم یہ فیصلہ کرکے آئے ہیں کہ اب صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جا سکتا، اب کام کا وقت آگیا ہے،!

بادشاہ سلامت۔ کیا کرنا چاہتے ہیں آپ؟ کیا کر سکتے ہیں آپ؟

میروفد۔ سب کچھ، ہر بات، جو کچھ بھی امکان میں ہو! بغاوت، شورش، یلغار، ـــــ بغیر اس کے کام نہیں بن سکتا،!

بادشاہ سلامت۔ لیکن وسائل و ذرائع،؟ ـــــ یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سب کچھ آپ کس بل بوتے پر کریں گے،؟

میروفد۔ خدا کے بھروسہ پر ـــــ اسلام کی تاریخ اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ بے مائگی کی حالت میں مسلمان اُٹھے، اور بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرائے، کامرانی نے ان کے قدم چومے، کامیابی کے ساتھ ساتھ چلی،!

بادشاہ سلامت۔ یہ ہم بھی جانتے ہیں، لیکن تم ایک بات بھول جاتے ہو، کہ جن مسلمانوں نے یہ یادگار اور ناقابلِ فراموش کامیابیاں حاصل کیں، وہ آپس میں ایک تھے متحد تھے، ان میں ہر شخص اپنے مقصد کے لئے جان دے دینا باعث فخر سمجھتا تھا، کیا اب بھی یہی صورت ہے؟ دوسروں کا ذکر، خود خاندان شاہی کا جو حال ہے، وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ مرزا قویاش بہادر نے جن شرائط پر و لی

لگ بھگ مسلمانوں نے ہم پر حکومت کی لیکن کبھی ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی، کبھی ہمارے دھرم پر ہاتھ نہیں ڈالا، ہمارے سماج کو ناپاک نہیں کیا، نہ نئے حکمران، جو نہ یہاں کے رہنے والے ہیں، نہ یہاں کی زبان جانتے ہیں، نہ یہاں کے حالات سے واقف ہیں، نہ ہمارے دُکھ درد سے واقف ہیں۔ کس طرح یہ حق رکھتے ہیں کہ ہمارے دین دھرم پر چھاپہ ماریں،!

نہیں، یہ نہیں ہو سکتا،!

خون کی ندیاں بہہ جائیں گی، مگر ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔

ہمارا دھرم اور دین خراب کرنے کے لئے انہوں نے بندوقوں کے کارتوس میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کرنا شروع کی ہے۔ تاکہ پہلے یہ ہندو مسلم فوج کو اپنی مرضی کے مطابق "کرشٹان"۔ بنالیں پھر باقی رعایا کا مذہب بدل لینا کون سا مشکل کام ہوگا؟ اس جذبہ کی اگر ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو بعد میں کچھ نہ کیا جا سکے گا!

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ اور یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا، لوگ مسجدوں میں مندروں میں، اسکولوں میں، مکتبوں میں، گھروں میں، مجلسوں میں، اس مسئلہ پر غور کرتے تھے، صلاح و مشورہ کرتے تھے۔

ایک روز شہر کے چند با اثر اور مقتدر (ہندو مسلمان) ایک وفد بنا کر شاہ جم جاہ، بہادر شاہ کی خدمت عالی میں حاضر ہوئے، جہاں پناہ اس وقت مسرور نظر آرہے تھے تبسم ہونٹوں پر کھیل رہا تھا، ملک الشعرا خاقانی سخن، استاد ذوق بھی بادشاہ کی خدمت

لہ کرستان۔ انگریزی کے لفظ "کرسچین" کی بگڑی ہوئی صورت ہے، تمام ہندو مسلم اور انگریز مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ غدر دلی کا آغاز صرف اسی چیز سے ہوا، لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ گائے اور سؤر کی چربی کارتوسوں میں استعمال کرکے یہ انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دین۔ کر دینا چاہتے ہیں!

کہ آپ شاعری میں گفتگو کریں، آپ نے جو کچھ تقریر کی ہے اس کا خلاصہ صرف ایک شعر میں بیان کیجئے،!

اُستاد ذوق۔ (کورنش بجالا کر) بندہ پروری ہے جہاں پناہ کی، ابھی لیجئے، غلام تعمیل ارشاد کرتا ہے (کچھ دیر سوچ کر) عرض کیا ہے، اسے

کوئی آوارہ ترے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا!

بادشاہ سلامت۔ (متاثر ہو کر) سبحان اللہ، ——— یہ الفاظ نہیں، تیر و نشتر ہیں آنے والے دور کی سچی تصویر، (ارکان وفد سے) آپ چند روز اور صبر کیجئے۔ جواں بخت کی شادی کے بعد، ہم اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے،!

مجلس برخاست ہو گئی! وفد رخصت ہو گیا، استاد ذوق بھی تشریف لے گئے مگر جہاں پناہ ایک تاثر کے عالم میں وہی شعر پڑھ رہے تھے،

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں، نہ ٹھہریگا!

عہد ی قبول کر کے، باپ کے منہ پر، اور خاندان کے نام پر کالک لگائی ہے ، سے ایک ایک بچّہ جانتا ہے۔ ——— ہم آگے بڑھیں گے۔ اور ہمارے عزیز، ہمارے بیٹے، ہمارے بھائی۔ ہمارے دوست ہمارے نمک خوار، ہماری پیٹھ میں چھُرا جھونکیں گے، پھر کیا ہو گا؟

میر وفد۔ ہم ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے،!

بادشاہ سلامت۔ تو یہ جہاد کہاں ہُوا؟ یہ جنگ آزادی کہاں ہوئی؟ ہم اگر آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگیں، تو بغیر کسی سعی و کوشش کے دشمن کامیاب ہو جائے گا ——— کیا یہ غلط ہے،؟

میر وفد۔ کچھ بھی ہو جہاں پناہ یہ زندگی تو اب برداشت نہیں ہوتی،!

بادشاہ سلامت۔ ٹھیک کہتے ہو ہماری بھی کیفیت ہے، یہ زندگی اب ایک بوجھ معلوم ہوتی ہے۔ ناقابلِ برداشت بوجھ۔ لیکن اس سے بڑھ کر خود غرضی بھی کوئی نہیں ہو سکتی کہ صرف اپنے خیالی فائدہ کی خاطر ہم اپنی عزیز رعایا کی گردنیں کٹوا دیں، ان کا خون سڑکوں اور گلیوں میں بہایا جائے۔ اور ہم ۳۱، کا انتقام نہ لے سکیں،!

میر وف۔ ذلّت کی زندگی سے مرگ باشرف کہیں اچھی ہے،!

استاد ذوق۔ جزاک اللہ، ٹھیک کہتے ہو میرے بھائی، اور میرا دل بھی گواہی دے رہا ہے کہ پاپ کی ناؤ اب اور نہیں چل سکتی، یہ ڈوبے گی اور ضرور ڈوبے گی، رعایا ان کے مظالم سے ان کے کرتوت سے تنگ آچکی ہے، وہ وقت جلد آنے والا ہے جب یہ تباہ ہوں گے، اور اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے،! انشا اللہ

بادشاہ سلامت۔ (مسکرا کر) ہم یہ تو جانتے تھے آپ ملک الشعرا ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ خطابت میں بھی آپ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں ۔

کی تعمیرات کی مرمت کرنا جائز نہیں شہر کے شمالی او رمغربی حصہ میں، وسیع باغات اور شرفاء کے مکانات واقع ہیں شہر کے شمالی حصہ میں شالامار باغ ہے، جس سے دہلی کے مضافات کا خوشگوار منظر نظر آتا ہے، اور یہاں بہت سی مساجد و مقابر وغیرہ کے کھنڈر پائے جاتے ہیں، خاص شہر میں بہت سے خوبصورت محل ہیں جو سب کے سب عظیم الشان اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں،

وسط شہر میں خوبصورت جامع مسجد واقع ہے۔ جو جولا پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہے، اس میں چڑھنے کے لئے سیڑھیاں ہیں، اور سرخ پتھروں کے دروازوں میں سے اندر جانے کا راستہ ہے، مسجد کا صحن کشادہ ہے، صحن سُرخ پتھر کا ہے، اس کے بیچوں بیچ فوارہ ہے جہاں بیٹھ کر وضو کیا جاتا ہے، چبوترہ پر سُرخ پتھر کے محراب دار دالان چلے گئے ہیں جن کے اُوپر بیٹھنے کی غرض سے ہشت پہلو برج بنے ہوئے ہیں، اس عمارت کے سامنے کا تمام حصہ خوبصورت سفید سنگِ مرمر کی سلوں سے بنایا گیا ہے اور ستونوں کے بالائی حصے کے برابر دس کتبے ہیں، جن میں سے ہر ایک چار فٹ لمبا اور ۲½ فٹ چوڑا ہے مسجد کا بیرونی حصہ سفید سنگِ مرمر کی بڑی بڑی سلوں سے بنایا گیا ہے، اور کنارے سنگِ موسیٰ سے بنائے گئے ہیں، اور یہ تمام کام نہایت نازک اور خوبصورت ہے، میناروں پر چڑھنے کے لئے پیچدار زینہ میں سے گذرنا پڑتا ہے، جس میں ۱۳۰ سیڑھیاں ہیں، ادھر سے شہر اور محل کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے،

اس مسجد کی ابتدا شہنشاہ شاہجہان نے اپنے سن جلوس کے چوتھے سال میں کی تھی، اور اس کی تکمیل سن جلوس کے دسویں سال میں ہوئی، کل لاگت دس لاکھ آئی تھی شہر میں اس وقت ۴۰۰ اور بڑی بڑی مسجدیں تھیں۔ جن میں کلاں مسجد (کالی مسجد) جو جدید شہر دہلی کی تعمیر سے ۴۰۵ سال قبل بنی تھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

دِلّی!

۱

"ــــــــ دہلی دریائے جمنا کے مغربی کنارے آباد ہے. موجودہ شہر تقریباً دس میل کے گھیر میں پھیلا ہُوا ہے، اور اس کے تین طرف اونچی فصیل ہے، جو اینٹوں اور پتھروں سے بنائی گئی ہے، اس کے سات دروازے ہیں. لاہوری[۱] دروازہ. دِلّی[۲] دروازہ اجمیری[۳] دروازہ، ترکمان[۴] دروازہ، موری[۵] دروازہ، کابلی[۶] دروازہ، اور کشمیری[۷] دروازہ یہ سب کے سب پتھر کے ہیں، اور ان میں خوبصورت محرابیں بنی ہوئی ہیں شہر کی گارد کے لئے رہنے کی بھی جگہیں ہیں، غدر سے چند سال قبل کرنیل ایڈورڈ اسمتھ انجنیئر نے کشمیری دروازہ کی از سر نو تعمیر کی تھی،

موجودہ شہر مسلمانوں کا تعمیر کردہ ہے، اس کی تعمیر، شاہجہان نے ۱۶۳۱ء میں کرائی تھی، شہر دریا سے دُور فصیلوں کے باہر واقع ہے جس زمانہ میں رچرڈ صلاح الدین اور عربوں کے خلاف صلیبی لڑائیاں لڑ رہا تھا، اس وقت دہلی میں ایک ہندو راجہ پرتھوی راج کرتا تھا، ہندوؤں کے زمانہ میں شہر کا نام اندرپرست تھا یعنی دیوتا اندر کے رہنے کی جگہ، موجودہ مہرولی اسی جگہ آباد ہے جو شاہ عالم اور اکبر شاہ مدفن ہے مقبرے اور کھنڈرات جو موجودہ شہر کے چاروں طرف بیس میل کے گھیرے میں پھیلے ہوئے ہیں، اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف زمانوں میں اس کے مختلف مقامات آباد رہے ہیں، کیونکہ ہندوؤں کے عقیدہ میں اپنے بزرگ

اس میں دیکھنے کی غرض سے سوراخ رکھے گئے تھے، اور شہر کی جانب کا حصہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا، ان دیواروں کے پیچھے مکانات کا وسیع سلسلہ تھا،

دلّی پر اب تک قدیم خاندان شاہی کا سایہ قائم تھا، اس وقت تک وہی عزّت کا واحد سر چشمہ خیال کیا جاتا تھا، اور وہی اصلی طاقت تھی جس کا ادب و احترام واجب تھا، راجہ نواب ابھی تک ان خطابات کا استعمال کرتے تھے جو بادشاہ انہیں عطا فرماتے تھے، ہر قسم کے سکّہ پر موجودالوقت شہنشاہ کا نام مضروب ہوتا تھا، چھوٹے چھوٹے والیان ریاست کی جانشینی کی درخواستیں ابھی تک ان کے نام بھیجی جاتی تھیں اور جب کبھی ان درخواستیں کو مسترد کر دیا جاتا، تو اس وقت ریزیڈنٹ سے اپیل کی جاتی تھی کہ وہ اپنا رسوخ استعمال کریں، اور مغلیہ شہنشاہ کو عرضی کنندگان کی درخواست منظور کرنے پر مائل کریں،!

دہلی کے باشندے اس بات کے عادی تھے کہ جب کبھی ان کے عظیم الشان شہر پر قبضہ کیا جائے تو اسے لوٹ لیا جائے، اور اس کے باشندوں کو تہہ تیغ کر دیا جائے ۱۳۹۸ء میں اگرچہ تیمور نے دہلی کو لوٹا۔ اور پانچ دن تک قتل عام جاری رکھا تاہم اپنی روانگی کی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس نے انسانی کھوپڑیوں کا ایک مینار بنوایا اور ناصرالدین کو تخت پر بٹھا کر وہاں سے رخصت ہو گیا، اسی طرح جب ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے شہر پر قبضہ کیا تو اس نے ہندوستانی مؤرخین کے قول کے مطابق ایک لاکھ باشندوں کا قتل عام کیا، اور باوجود اس کے اس نے محمد شاہ کی جان نہیں لی بلکہ اسے تخت پر بٹھا کر اپنے ملک کو چلا گیا، ہر حادثہ کے بعد شہنشاہ تخت پر قائم و برقرار رہا، اور رفتہ رفتہ اس نے اپنی شان کو دوبارہ حاصل کر لیا، لیکن جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ انگریز جانشینی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، اور خاندان کو منتشر کر دینا چاہتے ہیں، تو اس وقت ہندؤں اور مسلمانوں دونوں کے جذبات کو ٹھیس لگی، جب ۱۸۲۶ء میں

ہمایوں کا مقبرہ سُرخ پتھر کی بلند جگہ پر واقع ہے، اس کا محیط ... ۲ فٹ ہے، یہ مدور ہے، اور اس پر سفید سنگِ مرمر کا بہت عالیشان گنبد بنا ہوا ہے، یہ مقبرہ میلوں دور سے دکھائی دیتا ہے، چبوترہ کے چاروں طرف چاروں کونوں میں چار مینار ایستادہ ہیں، جو سنگ سُرخ اور سنگِ مرمر سے بنائے گئے ہیں، سب سے بڑے دالان میں ہمایوں کا مقبرہ ہے، تمام فرش سفید سنگِ مرمر کی سلوں سے مرکب ہے قبر پر بہت ہی نفیس کھدائی کا کام کیا ہوا ہے۔ قریب کے دالانوں میں آلِ تیمور کی چند شہزادیوں کی قبریں ہیں، چبوترے پر ان شہزادوں کی قبریں ہیں، جو وقتاً فوقتاً قتل کر دیئے گئے تھے، شہنشاہ عالمگیر ثانی بھی یہیں مدفون ہے، جسے اُس کے وزیر غازی الدین کی تحریک پر قتل کیا گیا تھا، زینت المساجد ایک اور خوبصورت مسجد ہے، جو دریائے جمنا کے کنارے واقع ہیں اس کے سامنے وسیع صحن ہے، چاندنی چوک کے ایک سرے پر روشن الدولہ کی مسجد ہے، (سنہری مسجد) یہیں سے شاہ ایران نادر شاہ نے مردوں، عورتوں اور بچوں قتل عام دیکھا تھا، یہ دونوں مساجد شہر کی مخصوص جگہوں میں شمار کی جاتی ہیں مضافات میں متعدد محلات کے عالیشان کھنڈر واقع ہیں۔

لال قلعہ اور اس کا محل جمنا کے کنارے واقع ہے، شہنشاہ شاہجہان نے اسے ۱۶۳۱/۳۲ء میں تعمیر کیا تھا، ابتداء میں اس کا پھیلاؤ ایک میل تھا، اصلی محل تقریباً ۳ ہزار فٹ لمبا اور ۱۸ سو فٹ چوڑا تھا، اس میں دیوان عام اور دیوان خاص تھے، دیوانِ خاص خالصتہً سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا طرح طرح کے پھول بوٹوں سے مزین تھا، عمارت کی چھت سفید سنگِ مرمر کی چوڑی چوڑی سلوں سے مرکب ہے، دیوان خاص کے شمال کی طرف محل، حمام خانے وغیرہ واقع تھے، محل پل کے ذریعہ قلعہ سلیم گڑھ سے ملحق تھا۔ دریا کی جانب کا حصہ سنگِ سُرخ کی ٹھوس دیوار سے محفوظ تھا، اور

قسمت کا فیصلہ

اور آج اسی دلّی میں، دلّی کی قسمت کا نہیں، سارے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔

یہ مجلس مشاورت مٹکاف ہاؤس میں منعقد ہوئی تھی۔

یہ دلّی کے نئے اور مستقل ریزیڈنٹ سر مٹکاف کا دولت خانہ ہے، جسے انہوں نے بڑے چاؤ او اہتمام سے بنوایا ہے، اس میں ایک ہزار ایکڑ کا ایک وسیع باغ ہے، نارنگی کے درخت ہر طرف ایستادہ نظر آتے ہیں، اس مجلس مشاورت میں جہاں ایک طرف انگریز اور چوٹی کے سرکاری عہدے دار بیٹھے ہیں، وہاں ان کے پہلو بہ پہلو لال قلعہ کے ذمہ دار اور سر بلند اصحاب بھی متمکن ہیں، ان میں مرزا الٰہی بخش[۱] خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مٹکاف صاحب نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور فیصلہ کن انداز میں فرمایا۔

سر مٹکاف: وقت آگیا ہے کہ اس ڈرامہ کا اب ڈراپ سین ہو جائے۔ یہ تماشہ اب زیادہ عرصہ تک نہیں جاری رکھا جا سکتا، نہ ذاتی طور پر میں اسے برداشت کر سکتا ہوں، نہ گورنر جنرل، نہ کورٹ آف ڈائرکٹرس، اور نہ انگلستان کی حکومت!!

---

[۱] یہ خاندان شاہی سے تعلق رکھتے تھے، بہادر شاہ کے سمدھی تھے، لیکن انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔

بہادر شاہ، اکبر شاہ کے بعد تخت نشین ہوئے تو اس وقت گورنر جنرل کی ہدایات کے مطابق اس امر کی کوشش کی گئی تھی، کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر تمام دعاوی سے دستبرداری حاصل کر لی جائے۔ مگر بادشاہ نے یہ درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا، اسی طرح بادشاہ کو قطب صاحب بھیج دینے کی تجویز بھی نہایت غصہ کے ساتھ مسترد کر دی گئی۔ [1]

---
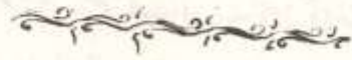
[1] غدر کی صبح و شام، یعنی جیون لال، اور معین الدین کے روزنامچۂ غدر کا دیباچہ جسے مٹکاف صاحب نے سپردِ قلم کیا تھا!

قیمت پر ان کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتے، ہاں وہ کمزور اِرادوں کے آدمی ہیں، لیکن خاندانِ شاہی کے لوگ، انہیں برابر بھڑکا رہے ہیں، اکسا رہے ہیں آمادۂ جہاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ——— !

سر مٹکاف۔ مثلاً، کون کون لوگ، ؟

مرزا الٰہی بخش۔ نواب زینت محل، ان کے فرزند دلبند، مرزا جواں بخت، جواں بخت کا نو عمرا ور محبوب ندیم بخت خان، جو فنونِ جنگ سے خوب واقف ہے ——— اور شہزادہ مرزا مغل بھی، !

سر مٹکاف۔ ہوں ——— اور مرزا قویاش کا کیا حال ہے !

مرزا الٰہی بخش۔ وہ اُمید سے زیادہ سعادت مند ثابت ہوگا،

سر مٹکاف۔ (تیوری چڑھا کر) اب ہم آپ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس دو عملی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں،

مرزا الٰہی بخش۔ میں آپ کا مطلب پورے طور پر اب بھی نہیں سمجھ سکا !

سر مٹکاف (ہنس کر) مرزا صاحب آپ بڑے بھولے آدمی ہیں مطلب بالکل صاف ہے، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ، بہادر شاہ کو حقوق بادشاہت سے محروم کر کے دلّی سے باہر کسی شہر میں رہنے پر مجبور کر دیں، !

مرزا الٰہی بخش۔ اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوئے تو، !

سر مٹکاف۔ تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ کا ہو چکا ہے

مرزا الٰہی بخش۔ لیکن واجد علی شاہ صرف ایک صوبہ کے بادشاہ تھے۔ اور بہادر شاہ پُورے مُلک کے بادشاہ ہیں، !

سر مٹکاف۔ ہاں ——— لیکن واجد علی شاہ، دولت، فوج، اور اثر و رسوخ کے

اسسٹنٹ ریزیڈنٹ ہیں تو ایک عرصہ سے یہی عرض کر رہا ہوں، لیکن کیا کیا جائے ہمارے افسران بالا دست، وہی کرتے ہیں جو انکی مرضی ہوتی ہے۔

سر مٹکاف۔ بہرحال اب وہ وقت ختم ہو گیا، اب گورنر جنرل میں، اور مجھ میں کوئی اختلاف نہیں ہے!

پھر سر مٹکاف نے مرزا الٰہی بخش کی طرف دیکھا اور کہا ہم آپ کے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، آپ کی وفاداری، ہمارے دل پر نقش ہے اور ہم اپنی اور گورنر جنرل کی طرف سے یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے خدمات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور ہمیں امید ہے کہ اس نازک مرحلہ پر آپ ہمارا ساتھ دیں گے۔

مرزا الٰہی بخش۔ میں انگریزوں کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں، جب سے ان کا دور دورہ ہوا ہے دنیا بدل گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنی قوم، ملک، ملت، خاندان اور آقا سے کٹ کر میں آپ کا ساتھ دے رہا ہوں، جو کچھ آپ پوچھتے ہیں بتا دیتا ہوں، جس امر کا آپ سراغ لگانا چاہتے ہیں، لگا دیتا ہوں، قلعہ میں جو سازشیں ہوتی ہیں جو کھچڑی پکتی ہے، جو اسکیمیں بنتی ہیں، ان کی معمولی سے معمولی تفصیل سے آپ کو باخبر کر دیتا ہوں، اگر اس کے بعد بھی کچھ باقی ہے، تو فرمایئے۔ اس کے بسر و چشم اپنے آپ کو آمادہ کر لوں گا۔!

سر مٹکاف۔ آپ کی ان کرمفرمائیوں کا ہر انگریز دل سے شکر گذار ہے، یقین کیجئے آپ کے اس خلوص نے ہماری نظر میں آپ کی وقعت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔!

مرزا الٰہی بخش۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اب آپ اس خاکسار سے کیا چاہتے ہیں؟

سر مٹکاف۔ یہی کہ قلعہ کی سرگرمیوں پر آپ کڑی نظر رکھیں، نیز یہ کہ بادشاہ کے رجحان کا اندازہ کرتے رہیں۔!

مرزا الٰہی بخش۔ وہ بھی عرض کر چکا وہ انگریزوں سے سخت بیزار او متنفر ہیں، اور کسی

محل کے اندر

دِلّی کے مٹکاف ہاؤس میں، کلکتہ کے گورنر جنرل ہاؤس میں، دِلّی کی گلیوں اور کوچوں میں بہادر شاہ کی قسمت، دِلّی کے مستقبل اور ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت پر ہوا نقانہ اور مخالفانہ بحثیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف نواب زینت محل اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے، جواں بخت کی شادی کی تیاریوں میں دل وجان مصروف تھیں، فرخ سلطان نے کشور کا عندیہ پا لیا کہ وہ اس رشتہ سے خوش ہے، جواں بخت کی داستانِ محبت وہ خود اس کی زبان سے دبے الفاظ میں چکی تھی اس نے زینت محل کو سارا ماجرا بتا رہا تھا۔ اور انہوں نے بڑی خوشی سے کشور کو اپنی بہو بنانا منظور کر لیا اس لئے کہ وہ اگر صورت میں چندے آفتاب، اور چندے ماہتاب تھی، تو سیرت میں بھی انتخاب تھی۔ نواب زینت محل یہ سُنکر کہ جواں بخت کشور کو چاہتا ہے بہت خوش ہوئیں، انہوں نے اپنے بیٹے کے حُسنِ انتخاب پر دل ہی دل میں اسے مبارک باد دی، دوسرے مرشد زادوں کے مقابلہ میں، وہ چال چلن، اور فکر و رائے کے اعتبار سے کتنا بہتر اور برتر تھا۔

زینت محل کی منظوری کے باوجود ابھی تین مرحلے بہت سخت باقی تھے، اور ان کا سر کرنا آسان نہ تھا،

بہادر شاہ، یوں تو نواب زینت محل پر جان دیتے تھے، اور ان کی کسی بات کو

اعتبار سے بادشاہ ہندوستان پر فائق تھے، ـــــ تھے یا نہیں؟ مگر وہ کچھ نہ کرسکے، کلکتہ میں محبوس و معذور بیٹھے کبوتر اڑا رہے تھے،!

مرزا الٰہی بخش۔ ٹھیک ہے ـــــ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ عوام کی طرف سے اس فیصلہ کی مزاحمت بہت شدید ہو گی،!

سرمٹکاف۔ کوئی پروا نہیں، مزاحمت خواہ کتنی ہی شدید ہو تلوار سے کاٹی جا سکتی ہے، لاٹھی سے توڑی جا سکتی ہے، بندوق سے مجروح کی جا سکتی ہے اور فوج کے پاؤں تلے روندی جا سکتی ہے۔ اگر کچھ فکر ہے، وہ صرف آپ کی ہے، آپ کے یا آپ کے رفقاً کے سوا کسی کے تعاون کی حاجت نہیں کسی کی مزاحمت سے اندیشہ نہیں،

مرزا الٰہی بخش۔ بندہ پروری ہے سرکار والاتبار کی،!

سرمٹکاف۔ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں لیکن ہر ہفتہ ہماری ملاقات ضروری ہونی چاہیئے،!

مرزا الٰہی بخش۔ انشا اللہ، انشاءاللہ، بہت خوب، آداب بجا لاتا ہوں۔

سماجی اور مالی پوزیشن ایسی تھی کہ اس رشتہ سے انکار کرسکیں۔

نواب زینت محل تو اس فکر میں تھی، اور ادھر کشور کی جان پر بنی تھی، اگر اسے یہ معلوم نہ ہوجاتا کہ جواں بخت اس سے محبت کرتا ہے، تو شاید رو دھو کر گوارا کرلیتی کہ مرزا قویاش کے دامن سے باندھ دی جائے۔ زندگی آخر کسی نہ کسی طرح گذار نی ہی ہے؟ اور پھر ایک شریف گھرانے کی باحیا عورت،!

لیکن اب کشور بدل چکی تھی، اب وہ ایک شخص سے محبّت کرتی تھی، وہ شخص اس سے محبّت کرتا تھا، اب اس میں سرکشی اور بغاوت کے جراثیم پیدا ہو رہے تھے اب وہ مجبوری کی زندگی بسر کرنے کو تیار نہیں تھی، اب اس کا یہ اٹل فیصلہ تھا کہ اگر اپنی مرضی کی زندگی نہ بسر نہ سکی، تو زندہ نہیں رہے گی، جب سے اسے یہ معلوم ہؤا تھا، کہ مرزا قویاش کا پیام آیا ہے، اس وقت سے اس پر خواب و خور حرام ہو رہا تھا، کسی پہلو چین نہیں پڑتا تھا، زندگی کی ہر رعنائی ناگوار محسوس ہوتی تھی، لطف و مسّرت کی محفلوں سے کوئی سروکار نہ رہ گیا تھا، چُپ چاپ بیٹھی رہتی، عجیب سوگواری کا سا عالم طاری تھا اس پر، گھر والے تھے ہی کتنے؟ لیکن جو تھے وہ بھی کیفیت کو حلالت اور طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے تھے۔ دل کا حال کوئی نہیں جانتا تھا، ایک فرخ سلطان ہمدم اور ہمراز تھی، لیکن ایسی گئی کہ پھر پلٹ کر نہ آئی، گویا مذاق کرنے آئی تھی، اور چلتی بنی، اسے کیا معلوم اس کی ان باتوں نے کسی کے دل میں آگ بھڑکا دی ہے اور اب اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں وہ خاکستر ہؤا چاہتی ہے، سارے گھر میں کوئی ایسا نہ تھا، جس سے وہ اپنا رازِ دل کہہ سکتی، جسے اپنا رازدان بنا سکتی، دل تھا کہ چُور ہؤا جا رہا تھا، سینہ تھا کہ پھٹا جا رہا تھا رُوح تھی کہ تحلیل ہوتی جا رہی تھی، جسم تھا جھُلسا جا رہا تھا ——— لیکن وہ خاموش تھی ——— خاموشی کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں تھا۔

ردّ نہیں کرتے تھے، لیکن معاملات و مسائل ہیں، جو فیصلہ کر لیتے اسے بدلا بھی نہیں کرتے تھے، اور سب جانتے تھے، تہوّر حسین کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی جس شخص کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہ ہو، وہ اس کی لڑکی کا رشتہ مانگیں، یہ آسان بات نہ تھی، نہ اس پر انہیں بظاہر آمادہ کیا جا سکتا تھا، دوسرے خود تہوّر حسین اگرچہ بڑے کھرے، بے لاگ، اور با سمجھ آدمی تھے، لیکن ذرا سنکی بھی تھے، جواں بخت کے بارے میں وہ اپنی رائے کا اظہار بھرے دربار میں کر چکے تھے، کہ ولی عہدی ان کا نہیں مرزا قویاش کا حق ہے، اب اسی جواں بخت سے وہ اپنی لڑکی بیاہ دیں، یہ بات بھی آسان نہیں تھی، اور تیسرے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ولی عہد مملکت مرزا قویاش سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، ان مراسم میں اگرچہ کسی حد تک جھول پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کا علم تہوّر حسین اور مرزا قویاش کے سوا کسی کو نہیں تھا، اس لئے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کچھ کہنے سے احتراز کرتے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مرزا قویاش کشور کے لئے اپنا پیام تہوّر حسین کو بھیج چکے تھے، یہ سچ ہے کہ ابھی انہوں نے ہاں ناں نہیں کی تھی لیکن ہر شخص سمجھتا تھا کہ یہ پیام ردّ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ایک تو ولی عہد سلطنت کا پیام کون بیوقوف ردّ کر سکتا تھا؟ دوسرے قویاش اور تہوّر حسین کے ذاتی تعلقات، سب سے بڑی سفارش تھے، اگر کوئی وجہ نامنظور کر دینے کی ہوتی بھی، تو اب وہ بروئے کار نہیں آ سکتی تھی، درحقیقت مرزا قویاش نے یہ ایک چال چلی تھی، وہ تہوّر حسین کو ہر بات میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے جن شرائط پر ولی عہدی قبول کی ہے، تہوّر حسین انہیں پسند نہیں کرتے اب ان سے تجدید مراسم کی صورت یہی تھی کہ ایسا رشتہ قائم ہو جائے، جو زندگی کی آخری سانس تک نہ ٹوٹ سکے، اور وہ رشتہ سوا اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ کشور کا ناطہ مانگ لیں اور تہوّر حسین اپنی ذات سے کتنے ہی بڑے آدمی ہوں لیکن، ان کی

کانٹا ہٹ گیا

کشوراسی سوچ میں میٹھی تھی کہ کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی، اس نے سوچا شاید امی حضور تشریف لارہی ہیں، پھر اپنے دل میں فیصلہ کیا، کچھ بھی ہو، آج دل بات زبان پر آکر رہے گی، سب کچھ کہہ دونگی ——— لیکن جوان بخت سے محبت کا حال نہیں!

اتنے میں دیکھتی کیا ہے، کہ فرخ سلطان آرہی ہے،!
بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکل گیا۔

فرخ سلطان،؟
وہ آئی اور اس کے گلے سے لپٹ گئی۔

فرخ سلطان:- ہاں میں! تمہیں، ناگوار ہوا، میرا آنا؟
کشور آرا۔ ہاں بہت زیادہ؟
فرخ سلطان۔ اچھا چلے جائیں گے ابھی، لیکن کچھ باتیں تو سُن لو،
کشور آرا۔ بخشو، معاف کرو، ہم نہیں سنتے کچھ،!
فرخ سلطان۔ سُنو، مُنہ میٹھا کرو، بیٹھ ٹھونگو، اتنا بڑا پالا مار کر آئی ہوں، کہ ہوتا تو عقیدت سے سر جھکا دیتا میرے سامنے، اور اگر تمہارے دل میں ذرا بھی احساس ہوتا، تو میری پیشانی چوم لیتیں،!

اگر کچھ سکون تھا تو صرف اس بات سے کہ مرزا قوباش کے پیغام نے گھر میں ہلچل کی کیفیت نہیں پیدا کی، اس کے معنی یہ تھے کہ تہور حسین نے اب تک اس پیام کو منظور نہیں کیا لیکن کیا جانے کب منظور کر لیں۔ ان کے مزاج کا کچھ ٹھکانہ ہے،؟

یہ سوچ کر پھر اسے فرخ سلطان یاد آجاتی، اور وہ دل ہی دل میں اسے بُرا بھلا کہنے لگتی، وہ سوچتی آخر وہ لاپتہ کیوں ہوگئی ہے؟ آتی کیوں نہیں!! اگر اس نے سچ کہا تھا تو اس خاموشی کے کیا معنی؟ اور اگر جھوٹ کہا تھا، تو ایک میں ہی رہ گئی تھی اس کے لئے کہ جھوٹ بول کر دل کی دنیا یوں ڈانواں ڈول کر دے؟

اور یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر کے سامنے مرزا قوباش کی تصویر پھرنے لگتی، ان کے کارنامے اجاگر ہو جاتے، اور وہ ان کے خیال تک سے نفرت کرنے لگتی۔

گھر میں سب سے زیادہ اگر کوئی اس کا مونس و دمساز تھا تو وہ، آج وہ سوچ رہی تھی کہ، امّی حضور سے کہدے "میں زندگی بھر یونہی بیٹھی رہوں گی، لیکن مرزا قوباش سے شادی نہیں کر سکتی، اور اگر اس سلسلہ میں اصرار اور جبر و جور سے کام لیا گیا تو پھر اس زندگی کا خاتمہ کر لوں گی!"

کئی مرتبہ اس نے سوچا، کہ اٹھے، اور ماں کی گود میں سر رکھ کر دل کی بات کہہ دے!

لیکن ہمت نہیں پڑی، شرم آگئی،!

جس ماں سے آس نے آج تک کھل کر بات نہیں کی تھی، اس سے اتنے بڑے اور کٹھن مسئلہ پر کیوں کر گفتگو کر سکے گی؟

اور اسی حیص بیص میں وقت گزرتا جا رہا تھا ——— وقت کے ساتھ بے کلی اور بے معنی بے رخی بڑھتی تھی۔

فرخ سلطان۔ اب بننے لگیں؟ ہم سے اڑو گی؟

کشور آرا۔ واقعی تمہاری یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔!

فرخ سلطان۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ تم اعتراف محبّت نہیں کرو گی؟ یہ نہیں مانو گی کہ جواں بخت سے محبّت کرتی ہو، اچھا نہ مانو، لیکن دل سے دل کو جو پیام پہنچتا ہے اسے کیا کرو گی؟ خدا کی قسم جھوٹ نہیں بولتی، ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔ جواں بخت کہہ رہا تھا کہ کشور ہرگز مرزا تو یاش کا پیام نہیں منظور کرے گی، میں نے پوچھا، اور اگر زبردستی کر دی گئی اس کی شادی تب کیا ہوگا؟ کہنے لگا، پھر ہم دونوں مرجائیں گے ــــ یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی، اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔!

اپنی گفتگو کا ردِعمل دیکھنے کے لئے جب نظر اُٹھا کر فرخ سلطان نے کشور کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی، زیادہ توجہ سے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں، اور غور سے دیکھا تو بڑی بڑی آنکھوں کے صدف سے، بڑے بڑے آبدار ــــ موتی ٹپ ٹپ گرنے لگے۔!

فرخ سلطان نے کشور کے آنسو اپنے دامن سے پونچھے، اور بڑے محبّت بھرے لہجہ میں کہا،

فرخ سلطان۔ ظالم ــــ مجھے غیر کیوں سمجھتی ہے؟ تیرے لئے دردر کی خاک چھان رہی ہوں، کسی کی ڈانٹ سنتی ہوں کہیں سے ترک ملتی ہے لیکن تو ہے کہ اپنا رازداں بنانا بھی منظور نہیں کرتی۔!

کشور آرا۔ کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو، بھلا اس دنیا میں فرخ کے سوا کشور کا دوست ہمراز اور ہمدم ہے کون؟

فرخ سلطان۔ تو اقرار کرو، تم جواں بخت سے محبّت کرتی ہو۔!

کشور آرا۔ اب چھوڑو بھی ان باتوں کو کہو کون سا مارا ہے، ذرا اس کا ذکر بھی تو سُنیں،!

فرخ سلطان۔ ہاں، وہی تو سنانے آئی تھی، مگر پہلے ایک بات تو بتاؤ کہ مرزا قویاش نے شادی کر وگی؟ یہ سنکر کشور کا چہرہ سفید پڑ گیا، جیسے بے گناہ کو پھانسی کی سزا سُنا دی گئی ہو۔ بولو، بتاؤ، ،تمہیں میرے سر کی قسم۔

کشور آرا۔ (سر جھکا کر) نہیں، تمہارے سر کی نہیں اپنی زندگی کی قسم کھاتی ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا، !

فرخ سلطان۔ کیوں، ——؟ آخر کس لئے؟

کشور آرا۔ میں نفرت کرتی ہوں، مرزا قویاش سے،؟

فرخ سلطان۔ ہاں وہ اسی قابل ہے کہ اس سے نفرت کی جائے لیکن سوال یہ ہے کہ تمہارے والدین نے یہ رشتہ منظور کر لیا، تب کیا کرو گی؟ ——

کشور آرا۔ جب ہی تو میری مرضی کے جوہر کھلیں گے، اگیا میں اپنی زندگی بھی ختم نہیں کر سکتی؟ یہ بہت معمولی بات ہے،!

فرخ سلطان۔ شاباش، سمجھ گئی،!

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

بالکل یہی فیصلہ جواں بخت کا بھی ہے، اچھا ہے، خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو،! —— سچ کہتی ہوں، جب جواں بخت کے کانوں تک یہ خبر پہنچے گی، کہ تم جان دینے پر تیار تھیں، لیکن قویاش سے شادی کرنے پر نہیں تھیں، تو وہ فرطِ مسرت سے دیوانہ ہو جائے گا؟

کشور آرا۔ یہ خوشی کی بالکل نئی قسم معلوم ہوتی ہے، —— لیکن میرے اس فیصلہ پر انہیں مسرور یا مغموم ہونے کا کیا حق ہے، میں نہیں سمجھتی ——!

کشور آرا۔ ابا حضور سے تمہیں شہزادہ جوان بخت کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے تھا؟

فرخ سلطان کیا تھا تمہیں ستانے کے لیۓ نہیں بتایا، میں نے کہا تو ماش سے لاکھ درجہ اچھا ہمارا جواں بخت ہے! ——— ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگے، بڑا ہونہار اور سعید ہے، خدا اسے زندہ رکھے، پروان چڑھے، اپنے دل میں اب تک نادم ہوں کہ اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوا، وہ تو ہیرا ہے میرا! ——— اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت تھی۔؟

کشور آرا۔ (مسکراکر) کرتی ہوں! ـــــــ تمہاری خاطر سے،!

فرخ سلطان۔ اقرار کرو، تم نے یہ راز اب تک مجھ سے چھپا کر غلطی کی تھی!

کشور آرا۔ اس کا اقرار نہیں کروں گی،! اس لئے کہ تمہیں میری کیفیت سے، باتوں سے، اندازے سمجھ لینا چاہیئے تھا، نہ سمجھو تو میرے پاس بے وقوفی کا کیا علاج ہے؟

فرخ سلطان۔ اچھا بھئی تم جیتیں، ہم ہارے، اب ذرا ہماری داستان بھی سُن لو، نواب زینت محل نے جب یہ سُنا کہ جواں بخت تم سے محبّت کرتا ہے بہت خوش ہوئیں، اس لئے کہ تمہیں وہ ہمیشہ سے چاہتی ہیں،!

کشور آرا۔ ہاں جانتی ہوں،!

فرخ سلطان کہنے لگیں کہ اس سے بڑھ کر میرے لئے مسرت کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ کشور میری بہو بن کر یہاں آئے، جہاں پناہ کو جس طرح بنے گا، میں رضامند کرلوں گی، لیکن یہ کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ ان کی توہین ہو اور تیمور حسین ہیں سنگی آدمی، تم جاکے پہلے انہیں ٹٹول کو، کچھ رضامند نظر آئیں تو باقاعدہ پیام بھیج دوں۔ پھر یہ بھی سُن رہی ہوں مرزا قویاش نے بھی پیام بھیجا ہے، مشکل ہی ہے کہ وہ ولی عہد کو چھوڑ کر جواں بخت کا پیام منظور کریں لیکن کوشش کرلینی چاہیئے ـــــــ میں سینہ ٹھوک کر چلی، اور سیدھی تمہارے ابا حضور کے پاس پہنچی، میں نے پوچھا کیا کشور کی شادی مرزا قویاش سے ہورہی ہے؟ ارے صاحب یہ سنتے ہی وہ تو بھبوکا ہوگئے، بڑے غصہ سے کہا، میری لڑکی کوڑا کرکٹ نہیں ہے کہ اسے کوڑے پر پھینک دوں، بس بہن، یہ سُن کر میں خوش خوش تمہارے پاس چلی آئی، اب ملکہ زینت محل باقاعدہ پیام بھیج کر تمہیں بہو بناکے جائیں گی!

لڑکی ہے میرا اور مجھ سے زیادہ اس کی ماں کا یخیال ہے کہ شادی شایانِ شان
ہونی چاہیئے، جہیز اور دوسرے مصارف کا انتظام کرنا ہے، میری مالی حالت
ایک عرصہ سے خراب ہے، قرض بھی لوں تو فوراً نہیں ملے گا، آخر اس بندو بست
کے لئے کچھ مہلت تو چاہیئے،!

زینت محل۔ ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی کوئی غیر گھر تو نہیں جا رہی
ہے،!

تہور حسین۔ یہ تو صحیح ہے لیکن ماں کے دل اور باپ کی تمنا پر غور کیجئے، ہم
میاں بیوی یہ نہیں برداشت کرسکتے، کہ اسے یونہی دو بول پڑھا کر رخصت
کر دیں، یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے،!

بادشاہ سلامت۔ تو ہم میں تم میں مغائرت کیا ہے؟ ــــــ جتنا روپیہ
درکار ہو ہم سے لے لو،!

تہور حسین۔ شکریہ، مگر میں ایسا نہیں کرسکتا،!

بادشاہ سلامت۔ یونہی مت لو، قرض بھی لے تو، اس میں تو کوئی مذائقہ نہیں ہے!

تہور حسین۔ جی آپ سے قرض بھی نہیں لے سکتا،!

زینت محل۔ یہ کیوں ــــــ ہم اتنے بُرے ہو گئے،؟

تہور حسین۔ استغفراللہ ــــــ اس میں آپ کی یا جہاں پناہ کی ذاتِ گرامی کا
کیا سوال، یہ تو دراصل میری معذوری ہے،!

زینت محل۔ تو پھر قرض کیوں نہیں لیتے، سہولت کے ساتھ ادا کر دینا،

تہور حسین۔ اس خاندان کا دیرینہ نمک خوار ہوں، قرض، تحفہ سب کچھ لے سکتا تھا
اگر شہزادہ جواں بخت سے یہ رشتہ نہ ہو رہا ہوتا، میری خودی بھی کوئی چیز ہے
میں اس رشتہ پر خودداری قربان نہیں کرسکتا، جلد بند و بست کر ونگا لیکن کچھ تو

شادی کی تیاریاں!

محل

بادشاہ سلامت نے خود تہور حسین کو بلا کر جواں بخت کا پیام دیا، نواب زینت بھی اس وقت موجود تھیں تہور حسین کا دل جواں بخت سے صاف ہو چکا تھا، بادشاہ کے اطاعت گذار اور وفادار ہمیشہ سے تھے، قوباش کی خودغرضی اور جاہ طلبی نے اب دل میں کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی تھی، فخر و مباہات کے ساتھ پیام منظور کر لیا لیکن جب ملکہ زینت محل نے ان سے کہا،

اب آپ کوئی مبارک تاریخ بھی اس تقریب سعید کے لئے مقرر کر دیجئے!

توانہوں نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا،

"تاریخ تو ابھی نہیں مقرر کر سکتا، اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا"!

بادشاہ سلامت - یہ کیوں بھائی! جب رشتہ منظور ہے، تو پھر تاریخ مقرر کرنے میں لیت و لعل کیوں؟

زینت محل - نہیں آپ کو تاریخ مقرر کرنی پڑے گی، اور جلد ہی ——— ہم اب انتظار نہیں کر سکتے۔ جواں بخت کا سہرا دیکھنے کی تمنا میں آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں"!

بادشاہ سلامت - اور بالکل یہی کیفیت ہماری بھی ہے!

تہور حسین - بجا ارشاد ہوا لیکن میری معذوریوں پر بھی تو غور فرمایئے، میری ایک ہی

پھر وہی رنگ

بات طے ہو گئی، محل میں شہنائیاں بجنے لگیں، دلی کے ہر باشندے کے دل میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی، جوش و خروش اور زور و شور کے ساتھ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، البتہ مرزا قوباش کے ہاں صف ماتم بچھ گئی۔

مرزا قوباش کو تہور حسین کے انکار کا اتنا صدمہ نہیں تھا، جتنا اس واقعہ کا کہ، کشور کی شادی جواں بخت سے ہو رہی ہے، یہ خبر سنکر صاحب عالم کے مصاحبوں میں سے ایک شخص مرتضیٰ علی بیگ نے کہا، !

" ملاحظہ فرمایئے، نمک حرام ایسے ہوتے ہیں —— یہ ہے صلہ صاحب عالم کے احسانات کا جو ہمیشہ اس کور نمک پر مبذول ہوتے رہے —— بخدا جی چاہتا ہے، گردن اڑا دوں مردود کی، !

دوسرے مصاحب، جھبو خاں اس خیالی جنگ میں اپنے حریف مرتضیٰ علی سے کیوں پیچھے رہتے، فرمایا،

" اماں ہٹو بھی، یہ گردن ماریں گے تہور حسین کی —— جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں صبح سن لینا مار ڈالا گیا تہور حسین، بندہ کوئی صلہ نہیں چاہتا، البتہ صاحب عالم سے ایک التماس ہے، یہ غلام جب تہور حسین کے الزام قتل میں گرفتار ہو اور اسے پھانسی دی جائے، اور آواز بھرا گئی، تو دو بول فاتحہ کے پڑھ دیں، اور ہو سکے تو قبر تک آجائیں۔ یہ

مہلت دیجئے، تاکہ خوشی اور مسرّت کے ساتھ اس تقریب کا انتظام کر سکوں "!

بادشاہ سلامت: ہمیں کوئی عذر نہیں، لیکن کتنی مہلت چاہیئے، یہ تو بتاؤ؟

تہوّر حسین۔ ایک سال۔ اس سے پہلے ہرگز بندوبست نہیں کر سکتا۔

زینت محل۔ یہ تو بڑی لمبی مدّت ہوئی اتنے طویل عرصہ تک ہم انتظار نہیں کریں گے

آپ کو ہماری بات ماننا پڑے گی، ؟

بادشاہ سلامت۔ اگر تم تہوّر حسین کو اچھی طرح جانتی ہو، پھر بھی ضد سے کام لیتی ہو

تہوّر وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے، پھر اصرار لاحاصل ہے،

زینت محل۔ لیجئے آپ بھی انہی کا ساتھ دینے لگے، میرا اور میرے بچے کا کوئی ساتھ

نہیں دیتا، !

بادشاہ سلامت۔ سُن رہے ہو تہوّر حسین، !

تہوّر حسین۔ غلام سُن رہا ہے، اور وہ بہت نادم ہے، اپنی اس معذوری پر، وہ

بڑی خوشی سے اپنی جان، اپنے بادشاہ اور ملکہ کی خوشی کے لئے قربان کر

سکتا ہے، لیکن اس معاملہ میں بالکل مجبوری ہے،!

بادشاہ سلامت۔ اچھا تو ہماری ایک تجویز ہے، " سے ان تو تمہاری بات بھی رہ

جائے گی، اور ملکہ کی خوشی بھی پُوری ہو جائے گی، وہ یہ کہ نکاح ابھی ہو جائے،

اور رخصتی ایک سال بعد ہو! —— اس میں تو تمہیں عذر نہیں ہے کچھ؟

تہوّر حسین۔ (کچھ سوچتے ہوئے) غلام کو اس تجویز کے ماننے میں کوئی عذر نہیں، !

بادشاہ سلامت۔ لو ملکہ تمہاری بات پُوری ہو گئی، اب تو خوش ہو !

زینت محل۔ جہاں پناہ کی فراست کا کہنا —— ایک تیر میں دو شکار کر لئے، !

بادشاہ سلامت (ہنس کر) بڑے مزے کی بات کہی، (تہوّر حسین سے، تو اب تاریخ مقرر ہو جانی چاہیئے۔ !

تہوّر حسین۔ ملکہ عالم جو تاریخ مقرر کر دیں مجھے منظور ہے۔

پڑ جائیں۔

جھبو خاں۔ بس تخت آپ کو جلد مل جائے گا۔ ــــ اس سے زیادہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ــــ عاقلاں را اشارہ کافیست ــــ!

مرزا قوباش۔ (پریشان ہو کر) نہیں جھبو خاں تم اس سلسلہ میں بھی کچھ مت کرو جس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے، اسے ہم قتل کیوں کریں۔ زمانہ بدل چکا ہے، کوئی مصیبت آن پڑی تو اور مشکل پڑ جائے گی۔ وقت آتا ہے کہ ہم ہر ایک سے چن چن کر بدلہ لیں گے۔

مرتضیٰ علی بیگ۔ بیشک بیشک۔

زندگی کیا ہے؟ اسی لئے ہے کہ مالک پر قربان ہو جائے، البتہ چھوٹے چھوٹے لونڈوں کی نبیی اور جوان بیوی کی بوگی کا خیال آتا ہے لیکن وہ لوگ بھی سمجھ لیں گے، کہ جب باپ اور شوہر اپنے مالک پر قربان ہوگیا، تو ہم گیا ہیں، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے اور فدا ہو جائیں گے، اپنے آقا پر!

یہ وفاوارانہ الفاظ کچھ ایسے تیور اور رلب ولہجہ میں جھبّو خاں نے ادا کئے، کہ مرتضیٰ علی صاحب کے تو چھکے چھوٹ گئے، کچھ سمجھ نہ آیا کیا کہیں؟ اور حریف شاطر منہ توڑ جواب کس طرح دیں؟ مرزا قوباش بہت متاثر ہوئے، انہوں نے فرمایا!

جھبّو خاں۔ ہم اتنے بڑے ایثار کا مطالبہ تم سے نہیں کرتے، وہ مڑمی کی ہانڈی گئی کتے کی ذات پہچانی گئی، معلوم ہوگیا کمبخت احسان فراموش، نمک حرام اور غدّار ہے، تخت شاہی قبضہ میں آنے دو، اس سے اور اس کے سارے خاندان سے نہ سمجھ لیں تو مرزا قوباش نام نہیں۔

مرتضیٰ علی نے اپنی گرمی گفتار بحال کرنے کے لئے کہا، !

"اور خدا وہ دن جلد لائے گا!"

اس وقت جھبّو خاں بڑی سوچ میں تھے، پھر وار کر گئے فرمایا،!

عورتوں کی طرح کوسنے کاٹنے سے کچھ نہیں ہوتا مرتضیٰ بھائی ہم نے اشارہ پالیا۔ اور یہ کام مجھی ہی سے ہوگا!

یہ اشارہ کیا تھا خود مرزا قوباش بھی نہیں سمجھے، انہوں نے کہا۔

جھبّو خاں کیا اشارہ پایا تم نے؟

جھبّو خاں بس غلام جانے یا آقا، اور کسی کو کیوں معلوم ہو؟ —— دیوار ہم گوش دارد! مرزا قوباش نہیں کوئی پرواہ نہ کرو، یہاں کوئی غیر نہیں ہے، مرتضیٰ علی بھی اپنا ہی آدمی ہے، کچھ معلوم تو ہو کر کیا سمجھے؟ ایسا نہ ہو کچھ اونچ نیچ پڑے تو لینے کے دینے

شہر کے ہندو مسلمان امرا اور رؤسا بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، عوام کا انبوہ بھی قابل دید تھا، مشکاف صاحب عوام کی عقیدت، خواص کی نیاز مندی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی بادشاہ پرستی کے مناظر دیکھ رہے تھے، اور دل میں جل رہے تھے، ان کا بس نہیں تھا کہ ان سب لوگوں کو ابھی ابھی پھانسی پر لٹکا دیتے۔

محل کے اندر ملکہ زینت محل کی مسرت کا آج کیا پوچھنا، پھول کی طرح کھلی جا رہی تھیں، بات بات پر مسکرا دیتی تھیں، خیرات اور داد و دہش کا سلسلہ جاری تھا، بادشاہ سلامت ابھی تک عبادت خانے سے برآمد نہیں ہوئے تھے، اس لئے قہقہے چہچہے ہنسی اور تفریح کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ اہل علم کا بھی ایک بڑا گروہ موجود تھا۔

ہندوستان کی ریاستوں اور رجواڑوں کے بہت سے نمائندے حاضر تھے، اور آس پاس کی ریاستوں کے حکمران تو بطور خود شریک تھے، تحفے تحائف کا ایک تانتا بندھا تھا، قیمتی سے قیمتی تحفے نذر دیئے جا رہے تھے، سرکار انگلشیہ کی طرف سے بھی کئی صندوق تحفوں کے آئے تھے، اور اسی انبار میں رکھے ہوئے تھے۔

دیوان عام اور دیوان خاص کی اس وقت، رونق اور شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، غلاموں، لونڈیوں اور محلاتِ شاہی کے کارندوں کا جلوس، الگ دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

آج کا اہتمام و انصرام اور سطوت و شوکت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا ہے کہ یہ بجھنے والے چراغ کی آخری بھڑک ہے۔ یہ موت سے پہلے کا سنبھالا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے خاندانِ مغلیہ کی عظمتِ رفتہ پھر سے واپس آ گئی ہے، وہی جاہ، وہی شکوہ و منزلت، وہی دم خم، وہی رعب و داب، وہی جلال و کمال، جس نے ساری دنیا میں مغل ایمپائر کو سربلند کر دیا تھا، آج کم از کم لال قلعہ میں پھر موجود ہے۔

شادی

جواں بخت کی نوید شادی نے سارے شہر کو وقفِ نشاط و طرب کر دیا تھا! اور آج، ــــــ شادی کے دن ــــــ تو صرف لال قلعہ نہیں، دلی کا ایک ایک کوچہ و بازار دلہن کی طرح سجا ہوا تھا جس گلی میں چلے جائیے جس کوچے سے گذر جائیے جس بازار میں پہنچ جائیے، ہر طرف عیش فراواں کا منظر نظر آئے گا، جسے دیکھئے مسرور و مخمور، جس سے پوچھئے، ایک ہی بات زبان پر، "آج جواں بخت کی شادی ہے،!"

جواں بخت اگر سارے ہندوستان کا نہیں تو دلی شہر کا ہیرو ضرور تھا،!

آج ہر گھر میں چراغاں تھا، ہر دوکان پر موم بتیاں جل رہی تھیں، ہر بازار میں چراغوں کی جگمگاہٹ سے عجیب سماں بندھ رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دیوالی کا تہوار اب کے وقت سے پہلے لوٹ آیا ہے،!

لال قلعہ کی رونق اور چہل پہل کا عالم ہی کچھ اور تھا، مرشد زادے، خانزادن شاہی کے متوسلین، بادشاہ اور ملکہ کے عزیز قریب، سب ہی صف بستہ موجود تھے، سر مٹکاف ریزیڈنٹ بہادر بھی نیازمندی کی شان کے ساتھ تشریف فرما تھے، وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خاں، سارے انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے، مرزا الٰہی بخش اپنے کام میں لگے تھے۔ کوئی نئی بات دیکھیں دل میں محفوظ کر لیں، اور موقع پا کر ریزیڈنٹ بہادر سر مٹکاف سے جڑ دیں۔

کشور آرا۔ اور تم ـــــــ ؟
فرخ سلطان۔ ہم نہیں مانتے ان تکلفات کو، !
کشور آرا۔ اور اگر کوئی آگیا تب کیا کرو گی، !
فرخ سلطان چپ ہو جائیں گے ـــــــ لیکن جب تک نہیں آتا، اس وقت تک تو کچھ باتیں کرو تاکہ ربن کٹے، !
کشور آرا۔ ہمیں باتیں نہیں آتیں، تم ہی اس فن کی بادشاہ ہو، تم کہو، ہم سنیں گے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔
فرخ سلطان۔ آج جواں بخت کو دولہا بنا دیکھا، ؟
کشور آرا۔ نہیں، ـــــــ !
فرخ سلطان۔ دیکھو گی ؟ ـــــــ
کشور آرا۔ جی نہیں، ـــــــ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ دولھامیاں کی تاک جھانک شروع کر دی جائے ؟
فرخ سلطان۔ سچ وہ آج بڑا اچھا لگ رہا ہے، ؟
کشور آرا۔ اور صاحب عالم مرزا مغل ؟
فرخ سلطان۔ ویسے ہی لگ رہے ہیں، جیسے روز لگتے ہیں، !
کشور آرا۔ تو ان میں (جواں بخت میں) کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں آج ؟
فرخ سلطان۔ اے ہے نام بھی لینے لگیں ابھی سے، ! ـــــــ "اُن میں" ـــــــ جواں بخت کیوں نہیں کہتیں ! گناہ ہے کچھ ؟
کشور آرا۔ تم لیتی ہو نام ؟
فرخ سلطان۔ ہاں کیوں نہیں لیتے، ؟
کشور آرا۔ آج تو تمہاری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے کیوں ؟ ـــ

مرزا قویاش، اور ان کے بعض متوسلین نے اس تقریب کا بائیکاٹ کیا تھا۔ وہ نہیں تشریف لائے، حالانکہ ملکہ زینت محل نے خاص طور پر بلاوا بھیجا تھا، اصرار کیا تھا، کہ ضرور آئیں، حاضرین میں سے ہر شخص مرزا کی اس حرکت پر دل ہی دل میں نفریں بھیج رہا تھا، اور ملازمت کر رہا تھا!

دیوان خاص میں زرکار و زرنگار فرش بچھا تھا، وسط میں ایک قیمتی قالین تھا، اس پر جوان بخت اور شہزادہ مغل طلائی و نقرئی سہرا باندھے دُولھا بنے بیٹھے تھے، مرزا مغل کی شادی خود انہی کی وجہ سے اب تک رکی ہوئی تھی، وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر — جوان بخت کی شادی ہوئی تو میں بھی کروں گا، ورنہ نہیں، ادھر فرخ سلطان بھی یہی فیصلہ کر چکی تھی کہ کشور کی شادی ہوئی، تو میں بھی دلہن بنوں گی ورنہ نہیں محل کے اندر ایک شاندار ایوان میں، کشور آرا، اور فرخ سلطان دلہن بنی بیٹھی تھیں، ان میں سے ایک پری پیکر اور دوسری حور مثال نظر آ رہی تھی، ایک تو بلا کا حسن، پھر زیور کی پھبن اور لباس کی سجاوٹ نے جمال میں، جلال کی کچھ ایسی آمیزش کر دی تھی کہ نظر کا ٹھہرنا محال ہو رہا تھا، دونوں کی سہلیاں بھی موجود تھیں، اور بڑی سختی سے اس امر کی نگرانی کر رہی تھیں کہ کوئی نامحرم۔ یعنی کوئی ایسی عورت نہ آنے پائے جس کے آنے سے یہ محفل بے تکلف، پُر تکلف ہو جائے، کشور اور فرخ بھی کامل یکسوئی کے ساتھ اس دلچسپ مجلس آرائی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، اگرچہ دونوں پر شرم و حیا کی کیفیت طاری تھی۔ پھر بھی آپس میں کبھی کبھی بات چیت کر لیتی تھیں، اور کبھی کبھی سہلیوں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب بھی دے دیتی تھیں۔ کشور نسبتاً خاموش تھی، فرخ اس کے مقابلہ میں بلبل کی طرح چہک رہی تھیں، اور چاہتی تھی کہ وہ بھی اسی طرح تکلف کو بالائے طاق رکھ کر بات میں حصہ لے، دونوں میں آہستہ آہستہ سرگوشیاں ہونے لگیں،

فرخ سلطان۔ کشور تم تو بالکل دلہن بنی ہوئی ہو،!

سلامت دیوانِ خاص میں تشریف لے آئے، قاضی صاحب بھی پہنچ چکے ہیں، اور شعرائے نامدار خاص طور پر مرزا غالب اور اُستاد ذوق بھی تشریف لے آئے ہیں، !
محفل میں جیسے ہی بادشاہ سلامت نے قدم رکھا سب سروقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے، اور وقار کی تصویر بنے ہوئے تشریف لائے۔ اور ایک خاص مسند پر رونق افروز ہو گئے، !

بادشاہ سلامت کی تشریف آوری کے تھوڑی دیر بعد رسم نکاح انجام پائی نقروں میں اشرفیاں لٹائی گئیں، روپے نچھاور ہوئے۔ حاضرین میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ اور پھولوں ہارے برسائے گئے، پھر امرا، روسا، تاجر، زمیندار، جاگیردار، حکام، امرا، اور ریزیڈنٹ باری باری سے حاضر ہوئے، آداب و تسلیمات اور کورنشات بجالائے اور سب نے حسب مقدرت نذر گذاری۔

جب مجمع چھٹ گیا اور خاص خاص مصاحب و ندیم رہ گئے تو بادشاہ سلامت مرزا غالب کو سہرا پڑھنے کی اجازت دی مرزا نے وہ سہرا پڑھا جس کا مطلع ہے ؎

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

خاقانی سخن استاد ذوق علیل تھے اس لئے سہرا نہ کہہ سکے، بادشاہ سلامت نے ان سے ارتجالاً سہرا کہلوایا۔ مطلع تھا ؎

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

سہرے کے اشعار واقعی بہت پائے کے تھے ایک ایک شعر پہ وہ داد ملی کہ چھتیں اڑ گئیں۔

اے فلک رشک سے نہ جل مرنا
بچھڑے ملتے ہیں بعد مدت کے

کیوں سچ ہے نا؟

فرخ سلطان۔ کیا کریں بھئی ہم نے بہت کوشش کی لیکن تمہارے ابا ایک ضدی آدمی ٹھہرے، وہ کب مانتے ہیں کسی کی، اڑ گئے، نکاح آج ہو گا رخصتی سال بھر ہو گی، جہاں پناہ اور ملکہ عالم کو بھی ان کی بات ماننا پڑی ——— اب روؤ سال بھر تک، کونے میں بیٹھ کر،!

کشور آرا۔ واہ روؤں کیوں، اس میں رونے کی کیا بات ہے، قسمت کا حسب دل خواہ فیصلہ تو گیا،!

فرخ سلطان۔ یعنی، ——— ہم تمہارے تم ہمارے ہو گئے ———؟

کشور آرا۔ ہاں، ——— کیا یہ معمولی بات ہے؟

فرخ سلطان۔ (جل کر) سچ کہا ہے مرزا نوشہ (مرزا غالب نے آج مان گئی، انہیں استاد، ان کا قول ہے۔ ع

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

اور کتنا صحیح قول ہے، واقعی تم تھیں اس قابل کہ ایک سال کی سزائے سخت دی جائے، ہمیں کیا ہے بھگتو بیٹھ کر،!

کشور آرا۔ بھگت لیں گے تم کیوں فکر میں ہلکان ہوئی جا رہی ہو، ہم جانیں اور ———

فرخ سلطان۔ ہاں اور کون؟ جواں بخت؟

کشور آرا۔ جی نہیں ——— صاحب عالم مرزا مغل،!

فرخ پھر کوئی چٹ پٹا جواب دینے والی تھی کہ زور شور سے شہنائی، طبل، برق اور قرنے کی آوازیں آنے لگیں، نوبت بجنے لگی، نقارہ پر چوٹ پڑی معلوم ہوا بادشاہ

وہ بولی: توقع سے بڑھ کر

کشور آرا۔ ہاں وہ بڑے اچھے آدمی ہیں، سب ہی ان کی تعریف کرتے ہیں۔

فرخ سلطان۔ کوئی میرے دل سے ان کی اچھائی پوچھے، لیکن جواں بخت کی بات ہی اور ہے،

کشور آرا۔ کیوں ان میں کون سی ایسی خاص بات ہے؟ کیا جادو کر دیا ہے، انہوں نے تم پر؟

فرخ سلطان۔ ایک مجھی پر کیا، ان کا جادو تو عام ہے، قلعہ میں جو ہے، انہی کا کلمہ پڑھتا ہے، شہر میں جو ہے انہی کے گن گاتا ہے محل میں جسے دیکھو ان کی خوبیاں بیان کر رہا ہے۔ بادشاہ سلامت وہ جان دیتے ہیں، ملکہ معظمہ ہیں وہ فریفتہ ہیں۔ سپاہی ہیں وہ اگر آنکھ بند کر کے کسی کے پسینے پر اپنا خون بہا دینے کو تیار رہیں، تو وہ جواں بخت کے سوا کون ہے۔

کشور آرا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر صاحب عالم مرزا مغل کی بھی بڑی توقیر ہے بہت مانتے ہیں لوگ انہیں۔

فرخ سلطان۔ بیشک مانتے ہیں لیکن وہ (مرزا مغل) بھی تو جان دیتے ہیں اپنے بھائی پر۔!

کشور آرا۔ ہاں بھائیوں میں ایسی ہی محبت ہونی چاہیئے، ایک وہ ہیں مرزا قویاش، ——— بہادر وہ بھی تو بھئی بھائی ہیں۔

فرخ سلطان۔ تم نے صبح صبح کس کا نام لے لیا، توبہ!

کشور آرا۔ یہ تو بتاؤ کیسی گذر رہی ہے تم دونوں کی؟

فرخ سلطان۔ بہت اچھی، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں، ایک دوسرے کی نظر پہچانتے ہیں، ایک دوسرے

بے سان گمان

جواں بخت کی زندگی کا اب نیا دور شروع ہوا تھا ـــــ نشاط و مسرت، کامرانی اور کامیابی، سرور و خمار کا دور!

اگرچہ کشور آرا اب تک اس سے دُور تھی، دونوں ایک دوسرے کی دید سے محروم تھے، لیکن پھر بھی، دل کو ایک طرح کا سکون تھا، وہ گوہر نایاب ہاتھ آچکا تھا جس کی یاد میں جس کی تمنا میں، جس کے شوق میں، زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف ہو رہا تھا، یہ کیا کم خوشی کی بات تھی کہ اب کشور اپنی تھی، اب وہ تا زندگی کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔

فرخ سلطان اور مرزا مغل کی زندگی کا نیا دور شروع ہو چکا تھا، اور یہ دور بھی ہر اعتبار سے شاندار تھا

کشور اور فرخ میں دوستی تو ہمیشہ سے تھی، لیکن اس شادی کے بعد سے، دونوں کی دوستی اور زیادہ مستحکم ہو گئی تھی، اکثر ایسا ہوتا کہ فرخ کشور کے ہاں چلی جاتی، یا کشور فرخ کے ہاں آجاتی پھر دونوں میں، دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو کر باتیں شروع ہو جاتیں۔

مرزا مغل آج صبح سے شکار گئے ہوئے تھے۔ فرخ کا اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا، تو اس نے مغلانی کو بھیج کر کشور کو بلا بھیجا، وہ آگئی، اور دونوں اس طرح مل کر بیٹھیں جیسے عرصہ دراز کے بعد دو سہیلیاں آپس میں باتیں کرنے بیٹھی ہوں۔

کشور نے پوچھا، فرخ سچ کہنا، تم نے صاحب عالم مرزا مغل کو کیسا پایا؟

جواں بخت۔ آگیا ــــ کیا نہ آیا کروں؟ کوئی قدغن ہے؟

فرخ سلطان۔ ہاں، ــــ!

اور وہ مسکرانے لگی،!

جواں بخت۔ لیکن میں آپ کے پاس کب آیا ہوں،!

فرخ سلطان۔ پھر کس کے پاس آئے ہو؟

جواں بخت۔ میں تو صاحب عالم مرزا مغل کے پاس حاضر ہوا تھا، کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنی ہیں ان سے ابھی اسی وقت!

فرخ سلطان۔ جی وہ شکار کو تشریف لے گئے ہیں، آپ بھی بندوق اٹھائیے، اور تشریف لے جائیے،!

جواں بخت۔ شکاری گھر میں بیٹھا ہے، اور شکار جنگل کی سیر کر رہا ہے یہ بھی عجیب تماشہ ہے،!

فرخ سلطان۔ یوں کہو شکاری پاس کے کمرہ میں چھپا بیٹھا ہے، اور شکار ہدف بننے کے لئے اس کا طواف کر رہا ہے صرف تم ہی حاضر جواب نہیں ہو، ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں،!

جواں بخت۔ (پاس بیٹھ کر) خدا آپ کو اور آپ کی زبان کو سلامت رکھے۔ آئیے کچھ کام کی باتیں کریں،

فرخ سلطان۔ فرمائیے، ارشاد، ــــ لیکن ایک بات سن لیجئے، میں آپ کے اور کشور کے بیچ میں نہیں پڑنے کی،

جواں بخت۔ سبحان اللہ ــــ تم نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے،! میں تو آپ کا معتقد بنتا چلا جا رہا ہوں۔

فرخ سلطان۔ جی، آپ معتقد نہیں مرید ہیں، لیکن زمین جنبد نہ جنبد، گل محمد

کے جذبات کا احترام کرتے ہیں،!

کشور آرا: تم دونوں نے تو محبت کو بڑا دشوار بنا دیا ہے، میں تو بہت آسان سمجھتی تھی اسے، بالعجب ہے، ہر ہر سانس ایک دوسرے کا خیال رکھنے میں صرف ہوتی ہے، نا بابا ہم تو باز آئے ایسی محبت سے،!

فرخ سلطان: تمہیں یہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑیں گے، اس لئے کہ تم محبوبہ ہو اور جواں بخت تم سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ لہٰذا جتنے نخرے دکھاؤ گی، وہ اٹھائیگا بیچارہ، اور ہم دونوں کا معاملہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، لہٰذا میری محبت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ان کا خیال رکھوں، ان کی محبت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ میرا خیال رکھیں، اس طرح محبت کی گاڑی کے ہم دونوں پہیے بن گئے ہیں،!

کشور آرا: لیکن تم ایک بات بھول گئیں، ــــــ محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی، اور اگر ہو تو ہوس ہوتی ہے!

فرخ سلطان: بہت اچھا، یہ خوش خبری میں جواں بخت تک پہنچا دوں گی۔ اے تو۔ بڑی عمر، آ ہی گیا، نہ جانے کہاں سے اس وقت اور واقعی جواں بخت سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا نکاح کے بعد سے اب تک کشور آرا اور جواں بخت کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا، آج پہلی مرتبہ یوں یک بیک دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ جواں بخت کی آنکھ اپنا کام کر رہی تھی، اور کشور کی نگاہ شرم جھک چکی تھی ــــــ وہ اُسے دیکھتے ہی جھپٹ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی! فرخ سلطان نے مصنوعی غصّہ سے جواں بخت کی طرف دیکھا، اور کڑے لہجہ میں کہا،!

"تم یہاں کیسے آ گئے اس وقت ــــــ؟

وہ نہیں ہو سکتا جو تم چاہتے ہو، خیریت سے ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاؤ!

جواں بخت۔ آپ اتنی سنگ دل ہیں، یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ صرف چند منٹ باتیں کرنے میں کیا حرج ہے!

فرخ سلطان۔ کوئی حرج نہیں ہے، کرو باتیں کس نے منع کیا ہے؟

جواں بخت۔ نہیں، آپ سے نہیں؟

فرخ سلطان۔ پھر کس سے؟ کشور سے

جواں بخت۔ جی ہاں، انہی سے۔ —— بس چند باتیں کرکے چلا جاؤنگا، بات چیت کرنا کچھ گناہ تو نہیں ہے، آخر وہ میری جائز بیوی ہیں، میں ان کا شوہر ہوں!

فرخ سلطان۔ تو یہ باتیں ہم سے کیوں کر رہے ہو، بڑے ہمت والے ہو تو جہاں پناہ سے عرض کرو، تہور حسین سے کہو، ملکہ عالم سے التماس کرو، ہم کون ہوتے ہیں کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والے —— واہ بھائی اچھا گھر دیکھ لیا ہے!

جواں بخت۔ اچھی بات تو چلا جاتا ہوں —— اس وقت کشور کو دیکھ کر جی چاہنے لگا تھا، باتیں کرنے کا، غضب خدا کا، آج تک ہم دونوں میں بات چیت بھی تو نہیں ہو سکی۔

فرخ سلطان۔ اس بیچاری کو بھی بہت افسوس ہے!

جواں بخت۔ پھر مذاق کرنے لگیں آپ، میں جا رہا ہوں سفر پر، جانے کب آنا ہو!

فرخ سلطان۔ سفر پر؟ —— کہاں جا رہے ہو تم؟

جواں بخت۔ جے پور —— ایک بہت ضروری کام سے، جہاں پناہ کا ایک پیغام لے کر جا رہا ہوں!

فرخ سلطان۔ واقعی؟ —— دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔

جواں بخت۔ بخدا سچ کہہ رہا ہوں!

بزمِ خاموش

کشور آرا دروازے کی اوٹ میں کھڑی اپنے محبوب کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، دفعتہً اس نے فرخ سلطان کو اپنی طرف آتا دیکھا، جلدی سے بھاگی اور کونے میں ایک مسہری پر جا کر بیٹھ گئی، اتنے میں فرخ آگئی اور اس نے کہا۔

دیکھو بھئی کشور، جواں بخت جا رہا ہے سفر پر، نجانے کتنے دن آنے جانے میں لگ جائیں، جاتے وقت تمہیں دیکھنا اور تم سے باتیں کرنا چاہتا ہے، میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں، آخر تم اس کی ہونے والی ہو، اور وہ تمہارا شوہر ہے، مل لوگی تو خوش خوش اپنی مہم پر جائے گا، اور یہاں کی ملاقات کی خبر کسی کو کانوں کان نہیں ہونے پائے گی اس کا ذمہ لیتی ہوں۔

قبل اس کے کہ کشورا اپنے حواس مجتمع کر کے کوئی جواب دے، فرخ سلطان نے آواز دی ——"آجاؤ!"

اور یہ سنتے ہی جواں بخت اندر آگیا، !

اسے آتا دیکھ کر کشورا اور زیادہ سمٹ سمٹا کر پیکرِ شرم و حیا بن کر بیٹھ گئی۔

فرخ سلطان نے جواں بخت سے کہا۔

جیسی تم دونوں کی شرافت پر اعتبار ہے،

تو وائی حسابِ کم و بیش، !

جب اس نے فرخ کے ساتھ اسے آتا دیکھا تھا تو وفورِ مسّرت سے اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا تھا۔

اس نے خود بھی دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نادر اور خداداد موقعہ سے فائدہ اُٹھائیگی، اس کی سُنے گی، اپنی کہے گی، اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی جان و دل کے مالک ہوں، لیکن ایک دوسرے سے دُور رہیں۔ ایک دوسرے کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائیں، ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر سکیں،

لیکن جب جواں بخت اس کے کمرہ میں آیا، اس کے پاس بیٹھا، تو اس کا دل اور زیادہ زور زور سے دھڑکنے لگا، اس کمرہ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا یہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور دونوں میں سے کسی کے لئے بھی گفتگو کا آغاز ناممکن ہے۔

اور جب وہ محروم و مایوس چلا گیا، تو کشور اپنی بے بسی کے آنسو ضبط نہ کر سکی ——— ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر،!

جواں بخت کو رخصت کر کے جب فرخ کشور کے کمرہ میں آئی، شاید جواں بخت سے اسکی محرومی کی ساری داستان سن چکی تھی، وہ آئی، اس نے کشور سے کہا:-

"بے وقوف کہیں کی!"

اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صحنچی میں لے گئی، وہاں جاکر بولی،

"میں کہتی ہوں، تم بالکل احمق ہو، بات کیوں نہیں کی اس سے؟"

کشور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:-

"پھر وہ مجھ سے زیادہ بیوقوف ہیں، وہ بھی تو خاموش بیٹھے رہے؟!"

ہم جا کر اپنی جگہ بیٹھتے ہیں، اطمینان سے باتیں کرلو، لیکن مختصر، گفتگو کا سلسلہ شب
فراق کی طرح دراز نہ ہونا چاہیئے!

یہ کہہ کر فرخ سلطان تو پھر جا کر کمرہ سے ملی ہوئی صحنچی میں بیٹھ گئی، اور یہاں جوان بخت
اور کشور آرا آمنے سامنے گم سم بیٹھے ہیں۔

نہ کشور میں یہ سکت کہ وہ باب سخن وا کرے، نہ جواں بخت میں ہمت کہ گفتگو کا
آغاز کرے، کشور کا سر جھکا تھا، آنکھیں جھکی تھیں، دوپٹے کا پلّو اس کے ہاتھ میں
تھا، اور وہ اسے مروڑ رہی تھی، جوان بخت خاموش بیٹھا تھا، اس کا چہرہ اس وقت
وفور تاثر سے تمتمایا ہوا تھا، وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، اپنا دل کر رکھ دینا چاہتا تھا
اپنی داستان عشق کا ایک ایک صفحہ سنا دینا چاہتا تھا، لیکن زبان یاری نہیں دیتی تھی
لب ساتھ نہیں دیتے تھے، وہ بار بار ارادہ کرتا تھا کہ کچھ کہے، لیکن ہر مرتبہ یہ ارادہ
ناکام ہوتا تھا، وہ پہلو بدل کر رہ جاتا تھا، کسی نے تاب تکلّم اس سے چھین لی تھی!

اور وقت تھا کہ سمند باد پا کی طرح دوڑا چلا جا رہا تھا،!

کافی دیر اسی طرح گذر گئی،!

دفعتہً فرخ سلطان اندر آئی، اس سے ان دونوں بتوں کو دیکھا، اور جواں بخت
سے کہا،!

"بہت دیر گئی، آ یئے تشریف لا یئے،!"

وہ ایک معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ باہر نکلا چلا گیا،!

اتنی دیر میں کشور پسینہ پسینہ ہو گئی تھی، جواں بخت کے جانے کے بعد ادھر
اُدھر نظر ڈالی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر پہلو بدلا اور پیشانی کا پسینہ رومال
سے صاف کیا۔

کشور نے جواں بخت کی ساری باتیں سن لی تھیں،!

فکر، وہ تو بس اپنی دھن میں مست رہتا ہے، تم میرا انتظار کیوں کرتی ہو، بھول کیوں نہیں جاتیں مجھے؟

بخت خاں کے چہرے پر اس وقت اضطراب وتشویش کی عجیب کیفیت طاری تھی، اس کی ایک ایک جنبش اور ایک ایک حرکت سے، ذہنی اذیت قلبی کوفت، روحانی تکلیف، اور غیر معمولی فکر و اندیشہ ہویدا تھا، وہ بہت تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کہیں بہت دُور سے آیا ہے،، پھر نہ جانے کتنی کڑی منزل پہ جا رہا ہے، دلاور علی خاں اور قدسیہ بیگم نے اس کے دِلی سے باہر آنے جانے کو کبھی نہیں محسوس کیا، وہ جانتے تھے، شاہی ملازم ہے، جہاں بھیجا جاتا ہے چلا جاتا ہے کام ختم کر کے واپس آجاتا ہے۔

لیکن جمیلہ بڑی گہری نظر سے اس کا جائزہ لیتی رہتی تھی، چنانچہ جس بات پر گھر بھر نے توجہ نہیں کی، اس نے اسے اہمیت دی، وہ اپنے دل کو ٹھکانے نہ کر سکی، اس کے دل میں بار بار کھٹک سی ہوتی تھی، بخت اب کچھ بدلتا سا جا رہا ہے، اب ایسے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، گھر والوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، مجھ سے کیسی ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتا تھا، لیکن اب مسافر کی طرح آیا، تھوڑی دیر بیٹھا، کھانا مل گیا، تو کھا لیا، نہ ملا تو بغیر کھائے چلا گیا، شہر میں رہتا ہے، تو اب خلافِ معمول بارہ بارہ بجے رات کو واپس آتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری ساری رات نہیں آتا، جب دیکھو جب پابہ رکاب، ایک دن کوچ کرتا ہے اور ایک مہینہ میں آتا ہے۔ آخر اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟ اس انقلاب کا سبب کیا ہے؟

..یہی سوچ کر آج اس نے ہلکی سی گرفت کی تھی، خیال تھا وہ باتوں باتوں میں کچھ اور کھلے گا، تو تفصیل معلوم ہو گی، لیکن اس نے بات ہی کاٹ دی، اس نے ایسا روکھا جواب دیا کہ پھر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی اس کی، بخت خاں نے جمیلہ کے

بخت خاں کھانا کھا کر ابھی اٹھا ہی تھا کہ جمیلہ نے پان لا کر دیا، اس نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا، پان منہ میں رکھا، اور باہر جانے کے لئے پگڑی درست کرنے لگا جمیلہ خاموشی سے اس کی نقل وحرکت دیکھ رہی تھی، جب اس نے پگڑی باندھ لی انگرکھا پہن لیا، تو جمیلہ نے ٹوکا۔

جمیلہ۔ پھر کہیں جا رہے ہیں آپ؟

بخت خاں۔ ہاں جمیلہ پھر جا رہا ہوں۔

جمیلہ۔ اب کب واپسی ہوگی؟

بخت خاں۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جمیلہ۔ پہلے چند دن کو کہہ کر گئے، اور کئی ہفتہ بعد واپس آئے، پھر ایک ہفتہ کو کہہ گئے اور پورے دو مہینے بعد لوٹے، اب پھر جا رہے ہیں، اور کچھ نہیں بتاتے واپسی کب ہوگی؟

بخت خاں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے کل ہی آجاؤں، ممکن ہے ہفتہ بھر بعد آؤں، ہو سکتا ہے کئی مہینے لگ جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے نہ آسکوں، کام آجاؤں، قربان ہو جاؤں، اپنے مقصد پر، مجھے تم ایسا آوارہ گرد کیوں نہیں سمجھ لیتیں جسے نہ اپنا ماضی یاد ہوتا ہے، نہ حال کی پروا ہوتی ہے، نہ مستقبل کی

اس کی اہمیت کا اندازہ لگالو، کہ تم کو تک کہ فراموش کر بیٹھا ہوں اس کے لئے دعا کرو، خدا مجھے ہمت دے، استقلال دے، کامیابی عطا فرمائے۔

جمیلہ۔ کب میں آپ کے لئے دُعا نہیں کرتی، لیکن خدا کے لئے بتادیں کیا کام ہے؟

بخت خاں۔ یہ نہ پوچھو کام کیا ہے اس کے اظہار کا وقت ابھی نہیں آیا، لیکن بہت جلد آجائے گا، اچھا، اب بہت دیر ہو گئی جمیلہ ہاں اب مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو، جب تک تم مسکرانہ دو گی، میرے قدم باہر نہیں نکلیں گے، مسکراؤ۔

جمیلہ۔ واہ، اچھی زبردستی ہے؟

بخت خاں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ میں یہاں سے خوش خوش جاؤں؟ تمہارا تبسّم میرا رفیق راہ ہو، جب کوئی مشکل پیش آئے وہ اسے آسان کر دے؟

یہ کہتے کہتے بخت خاں کی آواز بھر آگئی، جمیلہ کی آنکھوں میں بھی آنسو لرز رہے تھے لیکن ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا، بخت خاں نے اپنی مراد پالی، اور وہ ہنسی خوشی آج پھر ایک نامعلوم سفر پر روانہ ہو گیا،!

سوال کا جواب دے کر جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس کی نظر جمیلہ کے روئے زیبا پر پڑی، اور یہ دیکھ کر وہ چکرا گیا کہ اسکی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں، وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔

بخت خاں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر بیٹھ گیا ارے تم رونے لگیں؟"

جمیلہ۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) آپ کو کیا؟ آپ جایئے اپنے کام سے۔

بخت خاں۔ ہاں چلا جاؤں گا، کچھ ایسی جلدی نہیں ہے، لیکن خدا کے لئے بتادو، تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے؟ کیا میں نے کوئی ایسی بات کہدی جو، تمہارے قلب نازک کو گراں گزری؟ اگر یہی بات ہے، تو میں معافی چاہتا ہوں معاف کر دو مجھے۔

جمیلہ۔ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کیجئے، آپ تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں، بھلا کوئی ایسی بات آپ کے منہ سے نکل سکتی ہے جو مجھے ناگوار ہو۔ اب کبھی ایسی بات نہ کہیئے گا۔

بخت خاں۔ اچھا، لیکن ضرور میری کوئی بات تمہیں ناگوار گذری ہے؟

جمیلہ۔ پھر وہی، کہہ تو دیا نہیں، پھر آپ ایک ہی بات کیوں کہے جا رہے ہیں؟ ہاں ایک بات ضرور پریشان رہی ہے مجھے، وہ یہ کہ آج کل آپ بہت مصروف بہت پریشان اور بہت ہکا بکا سے نظر آتے ہیں۔

بخت خاں۔ ہاں جمیلہ تمہارا اندازہ صحیح ہے میری کیفیت آج کل واقعی یہی ہے۔

جمیلہ۔ وہی تو پوچھ رہی تھی لیکن آپ نے تقریر شروع کردی، پھر میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

بخت خاں۔ تمہارا یہ التفات میرا حاصل حیات ہے میری زندگی کی سب سے قیمتی پونجی ہے لیکن آج کل میں جس کام میں مصروف ہوں، وہ بے حد اہم ہے،

آنے والا طوفان

"۱۰ مئی"!

جانے اس لفظ میں کیا دو تھا، جس شخص کی زبان پہ دیکھئے، یہی لفظ چڑھا ہوا تھا،!

بھٹیار خانوں میں، سراؤں میں، حویلیوں میں، دفتروں میں، ایوانوں میں قلعہ میں مٹکاف ہاؤس میں، فوج کی بارکوں میں، انگریزوں کے آفسوں میں، ہر جگہ اس لفظ کا چرچا تھا ـــــ!

ایسا معلوم ہوتا تھا، کسی آنے والے طوفان کی علامت ہے یہ،!

کیا ہو سکتا ہے وہ طوفان؟

یہ کوئی نہیں جانتا تھا، البتہ ہر نئے سانحہ پر، ہر نئے واقعہ پر، ہر نئے حادثہ پر، تماشائیوں کے منہ سے بے ساختہ یہ لفظ نکل جاتا تھا،

"۱۰ مئی"!

کہیں یہ لفظ خوف و دہشت کی علامت تھا، کہیں اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا، کہیں اس پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں،!

لیکن ایسی کوئی جگہ نہ تھی، جہاں یہ لفظ نہ پہنچ چکا ہو،!

اور اب کچھ ایسی نئی نئی باتیں ہونے لگی تھیں جنہوں نے عوام اور خواص پہ

دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔!

"دلّی کے اندر وسیع پیمانہ پر چپاتیاں تقسیم کی جا رہی تھیں، اور یہ بجائے خود بہت بڑی فال تھی، علاقہ پہاڑ گنج کے تھانہ دار کے پاس جو شہر دہلی سے باہر واقع تھا۔ ایک دن صبح کے وقت اندرپت کا چوکیدار آیا اور اطلاع دی کہ سرائے فرخ خاں کا چوکیدار مجھے ایک چپاتی دے گیا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی پانچ چپاتیاں پکا کے قریب کے پانچ دیہات میں تقسیم کر دینا، اس ہدایت کے ساتھ کہ ہر گاؤں کا چوکیدار بغرض تقسیم اسی قسم کی پانچ روٹیاں پکائے، چپاتی جو اور گیہوں کے آٹے کی ہوتی تھی اور مرد کی ہتھیلی کے برابر، اس کا وزن دو تولہ تھا، تھانہ دار کو تعجب ہوا، اس نے محسوس کیا کہ چوکیدار سچ کہتا ہے، اور یہ کہ اس روٹی میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے تمام ہندوستانی باشندوں میں ایک گونہ خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ یکایک ایک دن یہ افواہ اُڑی کہ بہرام پور کی ۱۹ ویں پلٹن نے ان کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا ہے، جو انہیں استعمال کرنے کی غرض سے دیئے گئے تھے۔ یہ کہ ۳۴ ویں پلٹن نے بھی اس قسم کی کارروائی کی ہے، اور یہ کہ اس پلٹن کی سات کمپنیوں کو برخاست بھی کر دیا گیا ہے، جب یہ خبر پھیلی لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے، انبالہ سے ان دنوں ایک ہندوستانی اخبار شائع ہوتا تھا اس نے مختلف پلٹنوں کی کارروائیوں کو اور بھی شہرت دے دی، یہ سمجھ کر کہ ان تمام باتوں کی تہہ میں کچھ اسرار ضرور ہے، تھانیدار نے فی الفور چند آدمیوں کو مقرر کر دیا تاکہ وہ تمام حلقہ کا معائنہ کریں، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ آیا اور دیہات میں بھی چپاتیاں تقسیم کی گئی ہیں یا نہیں، ان کی مزید تقسیم کو روک دیں۔[1]

اس واقعہ نے سارے شہر میں بلکہ دوسرے شہروں میں بھی ہراس کی کیفیت

---

[1] غدر کی صبح و شام

بادشاہ سلامت کے سمدھی ہیں لیکن باقاعدہ انگریزوں کے پٹھو اور جاسوس بنے ہوئے ہیں۔

"کوئی حرج نہیں"

"۱۰ر مئی!"

"۱۰ر ——— مئی ——— وہ دن جلد آنے والا ہے!"

"آجائے۔ تو پھر احسن اللہ خاں، الہٰی بخش، اور دوسرے غداروں اور جاسوسوں سے اچھی طرح سمجھ لیا جائے گا"

"اب تک بادشاہ سلامت متامل تھے۔ لیکن اب وہ بھی انگریزوں سے متنفر ہو چکے ہیں، وہ ہمارا ساتھ دیں گے۔ ہم ان کے پسینہ پر خون بہائیں گے!"

"دلی لکھنؤ نہیں ہے ——— واجد علی شاہ اور بہادر شاہ میں بہت فرق ہے!"

طاری کردی،

ہر شخص اپنی جگہ بے چین اور مضطر تھا،!

جوں جوں ،، امئی قریب آرہی تھی، ـــــ اور ابھی اس کے آنے میں دیر تھی، ـــــ لوگوں کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی،!

،ارمئی کو کیا ہو گا؟"

جو سنتا سہم کر یا تو خاموش ہو جاتا تھا، یا کسی دوسری طرف نکل جاتا، یا دبی زبان میں کہتا تھا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا ہونے والا ہے ـــــ لیکن کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔"

لیکن یہ کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور،، کیا ہو سکتا ہے،؟

دلی ہمیشہ سے لٹتی چلی آئی ہے، کیا اس مرتبہ پھر لٹے گی؟

اب تک صرف شہریوں پر ہراس تھا، اب یہ ہراس پلٹنوں اور فوج کی بارکوں میں بھی پہنچ رہا تھا، وہاں بھی ہر شخص منتظر تھا کہ، ارمئی کب آتی ہے، اور کب وہ طوفان ظہور میں آتا ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے،؟

کچھ لوگ کہتے تھے، انگریزوں کی نیت بد ہے جس طرح انہوں نے اودھ کی حکومت ختم کر دی،، اور واجد علی شاہ کو جلاوطن کر دیا، اسی طرح اب دلی کی حکومت ختم ہو گی، اور بادشاہ سلامت جلاوطن اور نظر بند کر دیئے جائیں گے بعض لوگ اس سلسلہ میں تاریخ کی مدد بھی لیتے تھے، اور بتاتے تھے کہ بالکل ایسا ہی لکھنؤ میں ہوا تھا آج بھی حکومت پر انگریز مسلط ہیں، بظاہر حکیم احسن اللہ خاں وزیر اعظم ہیں۔ لیکن وہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں، جو ان کی مرضی ہوتی ہے کرتے ہیں، نہ بادشاہ سلامت کے احکام و فرامین کی پروا، نہ ملک کی عافیت اور امن کا خیال نہ قوم کی آزادی اور حریت کا احساس، اور یہ دوسرے بزرگ مرزا الٰہی بخش ہیں، اگرچہ

کرسکتا ہوں؟ آج یہاں راجگان راجستان موجود ہیں سب آپ کی باتیں سنیں گے ان پر سنجیدگی اور ہمدردی سے غور کریں گے اور پھر جو رائے قائم ہو گی اس سے آپ کو مطلع کر دیا جائے گا!

جواں بخت کوئی لمبی چوڑی بات نہیں — صرف یہ کہ انگریز رفتہ رفتہ اس دیس کے مالک بنتے چلے جا رہے ہیں، وہ طلم، جو کے ذریعہ اپنی بادشاہت کو مستحکم کر رہے ہیں، انہوں نے نہ جانے کتنی ریاستیں ہضم کر لیں، کتنی بادشاہتوں کا تختہ اُلٹ دیا کتنے راجاؤں، مہاراجاؤں، بادشاہوں اور ملک کے سربرآوردہ اور بااختیار اصحاب کو معزول کر دیا۔

مہاراجہ بوندی سچا، شاد ہوا، انگریز ملک کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چلے ہیں۔

مہاراجہ کوٹہ - اندیشہ یہ ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو نہ کوئی ریاست باقی رہیگی نہ حکومت،

جواں بخت - لہذا ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس کا تدارک کس طرح ہو سکتا ہے، آپ کو حیرت ہو گی بادشاہ سلامت نے مجھے حیدرآباد، بھوپال، گوالیار، اندور اور دوسری بڑی بڑی ریاستوں کے بجائے جے پور کیوں بھیجا؟ راجستان کے فرمانرواؤں پر اپنا نگاہِ نگاہ واضح کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

مہاراجہ جے پور - ہم نہیں جانتے، لیکن معلوم کرنا چاہتے ہیں،

جواں بخت - جے پور دلّی کا بہت قدیم دوست ہے، اُودے پور اور دلّی کا واسطہ بھی بہت پرانا ہے، راجستان کی دوسری ریاستیں بھی ہمارے لئے وہی حیثیت رکھتی ہیں، جو ایک خاندان کے مختلف افراد آپس رکھتے ہیں، آپ سے ہمارا خون کا رشتہ قائم ہو چکا ہے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے وقت سے یہ تعلقات

جے پور

جواں بخت اپنے چند جاں نثار رفقا کے ساتھ جے پور روانہ ہوگیا جے پور میں اس کی آمد پرائیوٹ تھی، لہٰذا نہ اس کے آنے کا م طور پر شہرہ ہوا نہ پبلک طور پر اس کا استقبال کیا گیا، مہاراجہ صاحب کے درِ دولت پہ پہنچا وہاں اس کی شایانِ شان پذیرائی ہوئی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک باجگزار ریاست اپنے شہنشاہ کے لختِ جگر اور نورِ نظر کی پذیرائی کر سکتی تھی، شاہی محل میں اسے ٹھہرایا گیا مہمانداری آسائش اور تواضع کا پورا پورا اہتمام کیا گیا تھا، شام کے کھانے کے بعد مہاراجہ جے پور، مہاراج اودے پور اور راجستان کے دوسرے والیانِ ریاست ادب و احترام، آداب سلطانی اور وقارِ شاہی کے پورے آداب و لوازم ملحوظ رکھتے ہوئے حاضر ہوئے کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوئیں، پھر جواں بخت حرفِ مطلب زبان پر لایا، اور اس نے صفائی کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

جواں بخت میں جس کے لئے آیا ہوں وہ مقصد آپ کو معلوم ہو چکا ہے، بتایئے
جہاں پناہ آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کریں؟ آپ ہمارا ساتھ دیں گے
یا انگریزوں کا؟

مہاراجہ جے پور۔ شہزادہ والا جاہ، آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ اس خادم سے فرمایا
تھا میری خواہش ہے، وہ باتیں آپ اس مجلس میں پھر سے دہرائیں، میں اکیلا کیا

مہاراجہ کوٹہ۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں، اس وقت اگر انگریزوں سے ہم نے چھیڑ خانی کی تو وہ فائدے میں رہیں گے، اور ہم گھاٹے میں!!

جواں بخت۔ یہ کیونکر ———؟

مہاراجہ کوٹہ۔ یہ اس طرح کہ اس وقت انگریزوں کے حوصلے بلند ہیں، اودھ کا وہ الحاق کر چکے ہیں، اور بھی کئی بڑی بڑی ریاستوں کا خاتمہ ان کے ہاتھ سے ہو چکا ہے، ان کے پاس تربیت یافتہ اور قواعد دان فوج ہے، روپیہ ہے وسائل و ذرائع ہیں، ہم نے اگر ان سے لڑنے کی کوشش کی تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو سلطان واجد علی شاہ کا ہو چکا ہے ——— اور کم از کم میں تو اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔

مہاراجہ جودھپور۔ اس کے لئے تیار ہو بھی کون سکتا ہے، آنکھوں دیکھتے تو مکھی نہیں نگلی جا سکتی، یوں اگر ہم سے سب کچھ چھین لیں، وہ الگ بات ہے لیکن ہم خود انہیں دعوتِ پیکار دیں تو اس کا انجام کیا ہوگا، یہ معلوم ہے۔

مہاراجہ بوندی۔ مہاراجہ صاحب کوٹہ نے واجد علی شاہ کا ذکر کیا ہے، واجد علی شاہ کے علاوہ بھی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ واجد علی شاہ کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ امورِ سلطنت اور انتظامِ مملکت سے غافل تھے عیش و عشرت میں زندگی بسر کر رہے تھے، خزانہ خالی تھا، فوج بے دل تھی، رعایا پریشان تھی، انگریزوں کو موقع مل گیا، انہوں نے قبضہ کر لیا لیکن بندہ نواز سکھوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ان کی بہادری اور شجاعت مسلّم ہے، انہوں نے بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا؟ پھر بھی نہ ٹک سکے، ہارے اور بری طرح ہارے، اور اب پنجاب بھی انگریزوں کا پرچم لہرا رہا ہے؛

جواں بخت۔ یقیناً آپ سخت اور شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں، آپ انگریزوں کو

مستحکم ہی ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں کبھی فرق نہیں آیا، میدانِ جنگ میں جب ہماری فوجیں نکلیں تو ان کے جنرل، سپہ سالار، حاکم، راجستان کے دلاور، غیور اور شجاع شہزادے ہوا کرتے تھے، ہم میں جب خانہ جنگی لڑائیاں ہوئیں تو بھی راجستان کے عزیز [illegible] بے نیاز نہ رہ سکے، مرہٹوں نے جب عہدہ عالمگیری میں سر سر اٹھایا، تو ان کی سرکوبی کے لئے جسے پہلے پہل بھیجا گیا وہ آپ ہی کے خاندان والا تھا۔ عزیز فرزند! ہماری تاریخ کے یہ ایسے واقعات ہیں، جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مہاراجہ جودھپور۔ بے شک، آپ کی یہ بات بالکل درست ہے۔

جوان [illegible]۔ جہاں پناہ کی رائے میں اب وقت آگیا ہے، کہ ہم سب متحد اور متفق ہو کر مشترک دشمن سے مقابلہ کریں، ورنہ اسے اس ملک سے باہر نکال دیں، یہ بات سر پر ایک ایسی مصیبت ہو گئی تلوار ہے جو سب کے لئے خطرہ ہے، ایسا خطرہ جس کا اگر اب تدارک نہ کیا گیا، تو پھر اس کا تدارک ناممکن ہو جائے گا، پھر دنیا کی کوئی طاقت اس خطرہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

مہاراجہ اودے پور۔ شہزادے صاحب، آپ نے جو کچھ فرمایا، اس میں کوئی بات غلط نہیں ہے، ایک ایک حرف صحیح ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ آیا۔ ہم اتنے بڑے ایسے طاقتور اور اس قدر ظالم اور جفاکار دشمن کا مقابلہ کر بھی سکتے ہیں؟

مہاراجہ بوندی۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد، آپ آگے بڑھیے ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے، تیل دیکھا جائے تیل کی دھار دیکھی جائے حالات کے ساز گار ہونے کا انتظار کیا جائے، اور پھر کسی مناسب اور موزوں پیرایہ کا رہی اختیار کی جائے کہ دشمن تڑپ تڑپ کے پھر سر نہ اٹھا سکے

ہمارے ہیں، دیہات اور شہر ہمارے ہیں، عمارتیں ہماری ہیں، مسجد اور مندر ہمارے ہیں ہم نے انہیں بنایا ہے، ہم نے ان کی تعمیر کی ہے، کیا اس لئے کہ انگریز ان پر قبضہ کریں۔ مالک بن بیٹھیں، اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں کیا اس بڑھ کر بھی کوئی اندھیر ہو سکتا ہے،؟

مہاراجہ جے پور۔ آپ کی باتوں میں زور ہے، وزن ہے،

جواں بخت۔ اس لئے کہ یہ سچی باتیں ہیں۔

مہاراجہ جے پور۔ مانتا ہوں دل سے تسلیم کرتا ہوں، واقعی سچائی میں بڑی قوت ہوتی ہے، لیکن ایک بات تو بتائیے۔

جواں بخت۔ فرمائیے ——— ضرور فرمائیے۔

مہاراجہ جے پور۔ انگریز ہم پہ فوجی برتری بھی تو رکھتے ہیں۔

جواں بخت۔ ہم کروڑوں کی تعداد میں بستے ہیں، لاکھوں کی فوج تیار کر لینا کیا مشکل ہے؟ ان کی فوج ہزاروں سے آگے نہیں بڑھ سکتی، ہم جب چاہیں۔ اپنی فوج اضافہ کر سکتے ہیں، انہیں ایک سپاہی بھی بڑھانا ہو تو انگلستان سے بلانا ہو گا، سات سمندر پار سے، ذرا سوچئے تو اس کے یہاں تک پہنچنے میں کتنے مہینے لگ جائیں گے ہم پہ کوئی مصیبت آئے تو اس دیس کا ایک ایک چپہ اور گوشہ ہماری پناہ گاہ بن سکتا ہے، انہیں اگر ہار ہو تو وہ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ کیا انہیں کہیں پناہ مل سکے گی؟ انہیں کوئی پناہ دے گا، آپ ان کی فوج کا نام لے کر دہلے کیوں جا رہے ہیں؟ وہ کچھ نہیں کر سکتے، سوا ہارنے کے، سوا شکست کھانے کے، سوا بھاگنے کے،

مہاراجہ بوندی۔ شاید میرا مدعا اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا ہم تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ان پہ غالب نہیں آ سکتے۔

مافوق الانسان سمجھ رہے ہیں، اور یہ قطعاً غلط ہے، انگریز بھی ہماری ہی طرح کے آدمی ہیں، ہار بھی سکتے ہیں اور جیت بھی سکتے ہیں۔

مہاراجہ بوندی لیکن ہم نے انہیں ہارتے نہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔

جواں بخت۔ آپ آنکھیں بند کرلیں، اور نہ دیکھیں تو میں کیا کرسکتا ہوں، آپ کانوں میں روئی ٹھونس لیں اور نہ سُنیں تو اس میں میری کوئی خطا نہیں —— یہ انگریز وہی تو ہیں جنہیں اسی ہندوستان کی سرزمین پر بارہا شکستیں ہوئیں، انہیں فرانسیسیوں نے کنوئیں جھنکوا دیئے، انہیں ٹیپو سلطان کی فوج نے پامال کیا، انہیں شجاع الدولہ نے تگنی کا ناچ نچایا، ان کی ہمت نہ ہوئی کہ احمد شاہ ابدالی سے آنکھیں ملا سکتے، آپ ان کی فطرت نہیں، ان کا اصول، ایک اور صرف ایک ہے، پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، ٹیپو انہیں ختم کردیتا، اگر انہوں نے نظام سے سازش کر لی ہوتی، شجاع الدولہ ان کا قلع قمع کر دیتا، اگر انہوں نے سازشوں سے کام لے کر اسے بے بس نہ کر دیا ہوتا

مہاراجہ جے پور۔ یہ تو تاریخی واقعات ہیں، اور بالکل درست ہیں۔

جواں بخت۔ انگریزوں کی دہشت صرف اس وقت تک قائم ہے، جب تک ہم آپس میں ایک دوسرے کو شک اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہیں جب تک ہم میں اختلافات ہیں، اگر یہ اختلافات ختم ہوجائیں، ہم ایک دوسرے پر اعتبار کرنے لگیں، پچھلی تمام باتیں فراموش کرکے متحد و متفق ہوجائیں، تو چند لمحوں میں ان کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے،!

مہاراجہ کوٹہ۔ ہاں —— اگر ایسا ہوسکے جس کی کوئی اُمید نہیں!

جواں بخت۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں مایوسی کی وجہ کیا ہے؟ ذرا غور تو کیجیے، یہ ہمارا ملک ہے۔ یہاں کے کھیت ہمارے ہیں، دریا ہمارے ہیں، سمندر اور پہاڑ

مہاراجہ جودھپور۔ آپ نے اس سلسلہ میں اور بھی کسی سے بات چیت کی ہے؟

جواں بخت۔ نہیں ـــــــ میں عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں پر آپ کو ترجیح دینے کا سبب کیا ہے؟

مہاراجہ جودھپور۔ اس عزت افزائی کے تو ہم شکر گزار ہیں لیکن یہ پہلو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، اور ملک کی دوسری ریاستوں اور راجاؤں نے، انگریزوں کا ساتھ دیا، جو قطعاً ممکن ہے تو پھر کیا ہوگا؟ پھر ہمارا حشر کیا ہوگا؟

جواں بخت۔ اگر راجستھان ہمارے ساتھ ہے تو پھر سکھ بھی جرات نہیں کر سکتے کہ انگریزوں کا ساتھ دیں۔

مہارانا اودے پور۔ یہ شہزادہ عالی قدر کا حسن ظن ہے۔

جواں بخت۔ یہ فرض محال، اگر ایسا ہوا تو یاد رکھیے اگر ہم انگریزوں سے نپٹ سکتے ہیں تو ان لوگوں کی سرکوبی بھی کر سکتے ہیں، جو غداری کے مرتکب ہوں، جو ملک کے مفاد سے دشمنی کا ارتکاب کریں جو ملک کے دوستوں سے دشمنی کریں، اور دشمنوں کو اپنا دوست بنا لیں، کیا آپ کو بتانے کی ضرورت ہے۔ کہ باغی کی سزا کیا ہوتی ہے؟ وہ تمام لوگ جو ہمارا ساتھ نہ دیں، ہمارے دشمن اور ملک کے غدار ہیں، ان سے وہی برتاؤ کیا جائے گا جو غداروں سے کیا جاتا ہے، انہیں عبرت انگیز سزا دی جائے گی۔

مہاراجہ بوندی۔ یہ تو خانہ جنگی کی صورت ہو گئی ہم انگریزوں سے لڑیں گے یا اپنے ہم وطن بھائیوں سے؟ ـــــــ دونوں سے لڑنا قطعاً ناممکن ہے۔

مہاراجہ کوٹہ۔ اور پھر ہمیں یہ بھی تو نہیں معلوم کہ اگر اس جنگ میں ہم شریک ہوئے، اور انگریز ہار گئے تو ہماری پوزیشن کیا ہوگی؟ ہم تو جیسے کو ہاؤ تا الدار اب

جواں بخت۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں یہ آپ کی غلط فہمی ہے!

مہاراجہ بوندی۔ کیونکہ شہزادہ عالی مرتبت؟

جواں بخت۔ دو سو آدمی اگرچہ کتنے ہی توانا، مضبوط، ماہر جنگ اور مسلح کیوں نہ ہوں لیکن اگر ان پہ دو ہزار آدمی صرف گر پڑیں، تو انہیں پیس کر سُرمہ بنا دینے کے لئے کافی ہیں، ذرا سوچئے تو، انگریزوں کی تھوڑی سی فوج، کہاں کہاں لڑے گی؟ مان لیا ایک مورچہ پر ہم شکست کھا جائیں گے لیکن دوسرے مورچے پر تو جیتیں گے؟ محاذِ جنگ ایک نہیں ہوگا متعدد ہوں گے، شاید صدہا۔ جنگ جیتنے کا ایک گُر یہ بھی تو ہے کہ لڑائی کو زیادہ سے زیادہ طول دو، اور محاذِ جنگ کی تعداد میں اضافہ کر دو، ہمارے وسائل و ذرائع اپنے ہیں کہ ہم جنگ کو بغیر تکلیف اُٹھائے کئی سال تک جاری رکھ سکتے ہیں ہمارا ملک اتنا وسیع ہے کہ ہم جتنے چاہیں مورچے قائم کر سکتے ہیں، ہمیں ہر چیز اس سرزمین پر دستیاب ہوگی وہ سوئی دھاگا بھی اپنے ملک سے، جو یہاں سے ہزاروں میل سے فاصلہ پر ہے منگانے پر مجبور ہونگے میں سچ کہتا ہوں مہاراجہ صاحب وہ ہمارے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے، بڑی ذلت بخش شکست سے دوچار ہوں گے،!

مہاراجہ جے پور۔ ہاں، یہ پہلو ضرور قابلِ غور ہے ایسا ہو تو سکتا ہے،!

جواں بخت۔ سب کچھ ہو سکتا ہے، اگر ہم طے کرلیں، فیصلہ کرلیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اندیشہ ہائے دور و دراز کو دل سے نکال دیا جائے۔ حوصلہ قائم رکھا جائے، اعتماد باہمی اور خلوص سے کیا جائے، پھر ساری مشکلیں آن کی آن میں حل ہو سکتی ہیں، ہمارا شاندار ماضی پھر واپس آسکتا ہے، تاریخ ایک مرتبہ پھر ہمارے کارناموں کو دوہرانے پر مجبور ہو جائے گی،!

دوڑاکرتا تھا۔

مہاراجہ جے پور نے رنگِ محفل دیکھا، تو انہیں صورت
حالات کی نزاکت کا احساس ہُوا، انہوں نے اس تلخی کو کم کرنے
کی کوشش کی، اور نہایت نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

مہاراجہ جے پور: شہزادہ والاجاہ —— میں ان الفاظ کی صدق دل سے معذرت آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں، جو آپ کے تکدّرِ طبع کا باعث ہوئے۔ مہاراجہ صاحب کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا جو آپ نے سمجھا، انہوں نے اپنا مفہوم غلط الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی، میں آپ کو حاضر الوقت . . . . کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ ہمیں دلّی کے تخت سے عقیدت ہے، ہم جہاں پناہ کا انتہائی ادب و احترام کرتے ہیں، اُتنا ہی جتنا ہمارے اسلاف آپ کے اسلاف کا کرتے تھے، ہمیں انگریزوں سے کوئی محبّت نہیں، ملک کے موجودہ حالات ہمارے لئے بھی اتنے ہی تشویش انگیز ہیں، جتنے آپ کے یا جہاں پناہ کے لئے، لیکن انقلابی قدم اُٹھاتے وقت ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ کیا ہوگا؟ یہ بات تھی جو مہاراجہ صاحب کوٹہ کہنا چاہتے تھے، لیکن بہک گئے کہنا کچھ چاہتے تھے، کہہ کچھ گئے،

جواں بخت: مجھے آپ کے مقصد سے اتفاق ہے، جہاں پناہ خود بھی یہ محسوس فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو انقلاب آفریں قدم اُٹھانے کی دعوت دی جائے تو اسے بتا دیا جائے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا صلہ کیا ہوگا؟ میں اس موضوع پر آ رہا تھا کہ مہاراجہ صاحب کوٹہ نے ایک تلخ اور ناگوار قسم کی بحث چھیڑ کر ساری فضا مکدّر کر دی!!

ہیں، ویسے ہی جب بھی رہیں گے۔ جیسے سوکھے ساون نہ ہرے بھادوں ماضی
میں کئی ہم سے ہو چکیں اب ہم ان کا اعادہ نہیں کر سکتے۔

یہ باتیں سُنکر جواں بخت کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا
لیکن اس نے ضبط سے کام لیا، اور بلند آواز سے
مہاراجہ صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

جواں بخت۔ آپ نے اپنی نیت بہت جلد آشکارا کر دی، اگر میری پوری بات سن لی ہوتی، تو شاید ایسا ناشائستہ کلمہ آپ کی زبان پر نہ آتا، آپ ایسے بھول گئے کہ آپ کا وجود، آپ کی مہاراجگی، آپ کی حکومت رہین منت ہے۔ ہمارے خاندان کی، وہ ہم تھے جنہوں نے آپ کو زندہ رکھا، وہ ہم تھے جنہوں نے آپ سربلند اور سرفراز کیا، وہ ہم تھے جنہوں نے آپ کو اعزاز وقار کا حامل بنایا، یہ آمیر کا قلعہ جہاں اس وقت میں بیٹھا ہوں اس کی ایک ایک اینٹ ہماری تاج بخشی کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ آمیر کی مسجد کس کے کارواں عروج واقبال کی یادگار ہے؟ آج جس تمدن جس تہذیب جس معاشرت اور جس طرزِ حیات پر آپ ناز کر رہے ہیں، یہ کس کا عطا کیا ہوا ہے؟ یہ سب کچھ آپ بھول گئے، یاد صرف یہ ہے کہ ماضی میں آپ نے غلطیاں کی تھیں، یعنی ہماری اطاعت کی تھی، کاش اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی یاد رکھا ہوتا کہ ہم نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا؟

یہ باتیں جواں بخت نے کچھ ایسے تیور اور ایسے چشم وابرو کے
ساتھ کہیں کہ تمام حاضرین گھبرا گئے، جواں بخت آج ایک تباہ
حال خاندان کا فرد تھا، لیکن اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ
رہا تھا جو اکبر اور ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی رگوں میں

پر آمادہ ہو جائیں ، !

جواں بخت - جہاں پناہ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایک مجلس قائم کریں گے جس میں راجگان راجستان اور دوسرے والیانِ ریاست ، جو ہمارا ساتھ دیں شریک ہوں گے جملہ شاہی اختیارات اس مجلس کو حاصل ہوں گے ، بادشاہ سلامت صرف سربراہ مملکت کی حیثیت سے لال قلعہ میں موجود رہیں گے ، امید ہے جہاں پناہ کی اس پیش کش کو آپ ، اسی رنگ میں دیکھیں گے ، جو اس کا مقصد ہے یعنی اس میں کسی خود غرضی کا شائبہ نہیں ، کسی طرح کی ذاتی منفعت اس سے مقصود نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ فرنگی استیلا سے نجات حاصل کی جائے !

مہاراجہ بوندی - اس مقصد کی رفعت اور بلندی سے کون انکار کر سکتا ہے ؟

جواں بخت - تو پھر آپ حضرات کیا فرماتے ہیں ؟

مہاراجہ جے پور - مسئلہ بے حد اہم ہے ، ہم غور و فکر کے بعد کوئی آخری جواب دے سکیں گے ۔
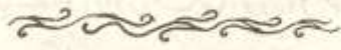
مہاراجہ جے پور۔ میں اس کی معذرت کر چکا اور اب پھر کرتا ہوں۔

جواں بخت۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں ایک بات تھی جو ختم ہو گئی، اب میرے دل میں اس کا کوئی خیال نہیں ہے،!

مہارانا اودے پور۔ ہاں، تو ابھی آپ کچھ فرما رہے تھے،؟

جواں بخت۔ جی ہاں، میں یہ بتانا چاہتا تھا، کہ جہاں پناہ نے اشتراک و تعاون کی دعوت دیتے ہوئے پیش کش کیا کی ہے،

مہاراجہ جے پور۔ پیش کش یہ جہاں پناہ کی طرف سے؟

جواں بخت۔ ہاں ـــــ جہاں پناہ کی پیش کش یہ ہے کہ اگر آپ سب حضرات خلوص، اتحاد اور سچائی کے ساتھ۔ اس معاملہ میں ساتھ دیں، انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی دل و جان سے کوشش کریں، ہر محاذ، ہر مورچہ اور ہر موقع پر پوری قوت اور کوشش کے ساتھ ان کا استیصال کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں تو وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ حضرات کے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہو جائیں گے،!

مہاراجہ جے پور۔ ہمارے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہو جائیں گے؟

جواں بخت۔ ہاں ـــــ انہوں نے یہی فرمایا تھا!

مہاراجہ کوٹہ۔ بھگوان جانتے ہیں، ہم میں سے ہرگز کسی کی یہ تمنا نہیں ہے کہ وہ ایسا کریں، خدا ان کا تخت و تاج سلامت رکھے وہ تا صد و سی سال زندہ رہیں، ہم ان کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ خدا کے لئے اب یہ نہ کہیئے گا،!

مہاراجہ بوندی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی کمزوری، بے ہمتی اور بے طاقتی کے باعث جنگ کے میدان میں نہ کود سکیں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا، کہ اپنے بادشاہ کی بدخواہی

جب سے اس کی ماں امجدی بیگم کا انتقال ہوا تھا، ان دونوں کی شفقتیں اور زیادہ ہوگئی تھیں، وہ اگر جمیلہ سے عشق نہ کرتا ہوتا، تو بھی اس پیش کش کا مسترد کرنا آسان نہیں تھا عجیب حیص بیص میں گرفتار تھا۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے؟ اور دلاور علی خاں تھے کہ اس کا جواب سننے کے لئے ٹکٹکی لگائے اسے دیکھے چلے جارہے تھے، جب کافی دیر گزر گئی اور بخت خاں کا سکوت قائم رہا، تو ذرا تلخی کے ساتھ دلاور علی خاں نے کہا۔

" اگر تمہیں میری یہ رائے منظور نہیں تو صاف صاف بے تامل کہدو، شادی بیاہ کے معاملہ میں جبر، مروّت اور لحاظ کا میں قائل نہیں ہوں!"

بخت نے اپنے حواس مجتمع کئے اور عرض کیا۔

" چچا جان یہ آپ کیا فرماتے ہیں، آپ مجھے اتنی بڑی نعمت دیں اور میں انکار کردوں؟ آپ میری زندگی سنواریں اور میں لیت و لعل سے کام لوں، مجھ پر آپ کا اتنا ہی حق ہے، جتنا دلیر، اور ہمت پر، جواب کی کیا ضرورت ہے، جو آپ فرمائیں گے، وہ ہوگا۔"

اس جواب سے خاں صاحب خوش ہوگئے، انہوں نے بخت کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

" تمہاری اس سعادت مندی سے میں بہت خوش ہوا، اس معاملہ میں مجھے جلدی یوں ہے کہ ویسے بھی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، دوسرے اس سال میں حج کو جانے کا فیصلہ کرچکا ہوں "صاحب" نے بھی اجازت دے دی ہے، حج کا سفر جانتے ہو، جان جوکھوں کا کام ہے، لہٰذا اس سے پہلے پہلے میں جمیلہ کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتا ہوں!"

بخت خاں نے فرزند سعادت مند کی طرح عرض کیا۔

" بہرحال اس سلسلہ میں مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ جو مناسب

خلوت میں

جوان بخت ابھی جے پور سے واپس نہیں آیا تھا بخت خاں اپنی کارگزاریوں میں مصروف تھا، کہ ایک روز دلاور علی خاں نے اسے پاس بُلایا، اور بغیر کسی تمہید کے اس سے کہا۔

" بیٹے میں چاہتا ہوں، اب تمہاری شادی کر دوں، تمہاری خدمت کے لئے جمیلہ کو میں نے متعین کیا ہے، وہ تمہاری مزاج داں بن چکی ہے! امید ہے تمہاری بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوگی،"!

بخت خاں کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ جمیلہ باقاعدہ طور پر اس کی ہو جائے، کوئی اور وقت ہوتا، تو وہ اس خوشخبری کی تاب نہ لا سکتا وفورِ مسرّت سے دیوانہ ہو جاتا لیکن اب وہ کسی اور ہی دھن میں مست تھا، اس نشہ نے عشق کا نشہ بھی ہرن کر رکھا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ جواب کیا دے؟ انکار کر سکتا تھا، اور اقرار بھی موجودہ حالات میں ممکن نہ تھا۔ یہ بات مختلف واسطوں سے اگر زیرِ بحث آتی۔ تو وہ کچھ عذر معذرت بھی کر سکتا تھا لیکن بے سان گمان "فعتہً" دلاور علی خاں نے یہ فیصلہ کر لیا، یہ فیصلہ دلاور علی خاں کا تھا، لہٰذا اسے ردّ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اسے رد کرنے کے معنی یہ تھے کہ جمیلہ سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لئے جائیں، دلاور علی خاں اور قدسیہ بیگم سے ہمیشہ کے لئے ترکِ تعلق کر لیا جائے

بخت خاں۔ ضرور کرتا۔
جمیلہ۔ پھر میری شکایت پر آپ تعجب کیوں کرتے ہیں؟
بخت خاں۔ نہیں شکایت کا حق ہے، سچ کہتا ہوں، میں کہیں بھی ہوں، دل ضرور تمہارے ہی پاس رہتا ہے، بیشک میں رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک غائب رہتا ہوں، لیکن کوئی پل ایسا نہیں گزرتا جب تم یاد نہ آتی ہو۔ تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے نہ پھرتی ہو، تمہاری پیاری پیاری سی باتیں میرے دل کے تار نہ چھیڑتی رہتی ہوں، دل تمہارے ہی پاس رہتا ہے
جمیلہ۔ بس تقریر کرنے لگے۔
بخت خاں۔ تقریر کروں یا وعظ کہوں، غلط تو نہیں کہتا؟
جمیلہ۔ ہم کیا جانیں۔
بخت خاں۔ یہ کیا کہا ــــــ جمیلہ کیا واقعی تم مجھ سے بدگمان ہوا۔
جمیلہ۔ بدگمانی کا سوال نہیں آپ میری تنہائی پر غور تو کریں، اتنے بڑے کمرے میں اکیلی پڑے پڑے ڈرا کرتی ہوں۔
بخت خاں۔ ارے تم ڈرپوک بھی ہو؟ ــــ بخت خاں کی بیوی اور ڈرپوک حد ہوگئی بخدا۔
جمیلہ۔ باتیں نہ بنائیے، ہر عورت ڈرتی ہے، !
بخت خاں۔ ہاں ڈرتی ہے لیکن اپنے میں؟ ایسا اندھیر کو کہیں نہیں ہوتا
جمیلہ۔ ہمیں تو لگتا ہے ڈر۔ یہ تو اپنی اپنی طبیعت ہے۔
ابھی ان میں باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دفعتہً بخت اور جمیلہ کے کانوں میں دلاور علی خاں کی آواز گونجی،
"کہاں ہے وہ نالائق، ننگِ خاندان، بلاؤ اسے!"
دونوں سہم سے گئے کہ آج کس کی شامت آئی ہے؟

سمجھیں کریں۔!"

دلاور علی خاں نے باہر جانے کے لئے اُٹھتے ہوئے دنوں کے نام گننا شروع کئے۔

"آج ہے منگل، کل بُدھ، پرسوں جمعرات، بس جمعہ کے دن یہ تقریب نہایت خاموشی اور سادگی کے ساتھ انجام پائے گی۔!"

یہ کہا اور خوش خوش باہر تشریف لے گئے۔

جمعہ کا مبارک دن آنے میں کتنی دیر لگتی تھی، وہ وقت مقررہ پر آ گیا! اور بخت خاں کی شادی جمیلہ سے ہو گئی۔

بخت خاں اور جمیلہ دونوں بے انتہا مسرور تھے، دونوں نے زندگی کا مدعا پا لیا تھا۔!

اگرچہ بخت خاں کو اپنی سرگرمیوں میں شب و روز مصروف و منہمک رہنا پڑتا تھا لیکن اب وہ جمیلہ کے لئے بھی کچھ وقت نکالتا تھا، اس کے پاس بیٹھتا تھا، باتیں کرتا تھا، اسے ہنساتا تھا، خوش رکھتا تھا، وہ چاہتا تھا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی وقت جمیلہ یہ نہ محسوس کر سکے کہ وہ اس کی طرف سے بے پرواہ ہے، غافل ہے،

شادی کو پندرہ بیس دن گزر چکے تھے جمیلہ اور بخت خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ جمیلہ نے کہا۔

"آپ کئی دن سے رات کو بہت دیر میں آنے لگے ہیں"

بخت خاں۔ (مسکرا کر) ہاں کچھ ایسا ہی مصروف ہو جاتا ہوں کہ دیر ہو جاتی ہے

کیوں کیا تمہیں کچھ شکایت ہے؟

جمیلہ۔ (زیر لب تبسم کے ساتھ) بتائیے آپ میری جگہ ہوتے تو شکایت کرتے یا نہیں؟

دلاور علی خاں: میں نے تمہیں اولاد سے زیادہ چاہا، تمہیں عصائے پیری سمجھا، تمہیں اپنا قوتِ دست و بازو بنایا، اور تم نے کیا کیا؟ تم نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا، تم نے مجھے ذلیل و رسوا کیا، تم نے مجھے مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھا، یہی کرنا چاہیے تھا تمہیں اپنے بوڑھے اور محبت کرنے والے چچا کے ساتھ؟

بخت خاں: چچا جان میں بالکل نہیں سمجھا آپ میری کس خطا پر برہم ہیں؟

دلاور علی خاں: خوب سمجھتے ہو، لیکن اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔!

بخت خاں: نہیں چچا جان، یہ نہ فرمایئے، میں ویسے بھی جھوٹ نہیں بولتا، اور آپ سے تو ہرگز نہیں بول سکتا۔ فرمایئے آپ کو کیا شکایت ہے اس خادم سے؟

دلاور علی خاں: نہیں تم معصوم ہو، تم مجرم ہو!

بخت خاں: اگر آپ کی یہ رائے ہے تو جُرم معلوم ہوئے بغیر میں اپنے مجرم اور خطاکار ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔

دلاور علی خاں: کیا تم بخت خاں نہیں ہو؟

بخت خاں: ضرور ہوں، میرا ہی نام بخت خاں ہے۔

دلاور علی خاں: کیا تم شہزادہ جواں بخت کے مشیر و ندیم نہیں ہو؟

بخت خاں: اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا،

دلاور علی خاں: کیا تم انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟ کیا تم جواں بخت کو بغاوت پر آمادہ نہیں کر رہے ہو؟ کیا تم جواں بخت کے ذریعہ جہاں پناہ کو بھی میدانِ جنگ میں لانے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ فوجیں بغاوت کریں، انگریز اس میں سے نکال دیئے جائیں، اور شاہی حکومت سارے ہندوستان پر پھر سے قائم ہو جائے!

خُداحافظ

ہمت گھبرایا ہؤا، افتاں و خیزاں کمرہ میں پہنچا، اور اس نے سراسیمگی کے عالم میں بخت سے کہا

" چلئے ابا جان آپ کو بلا رہے ہیں، بہت غصّہ میں ہیں اس وقت، نہ جانے کیا بات ہے!"

بخت خاں جانے کے لئے اٹھا لیکن جمیا نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

" نہ جائیے ـــــ نہ معلوم اس وقت اتنے غصّہ میں کیوں ہیں ـــ جا ہمت، کہدے وہ یہاں نہیں ہیں!"

ہمّت نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

" میں تو کہہ چکا ہوں، وہ باجی کے پاس بیٹھے ہیں!"

بخت خاں اُٹھ کھڑا ہؤا

" تم نے انہیں میری موجودگی کی اطلاع نہ دی ہوتی تو بھی میں چلتا، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے وہ بلائیں اور میں نہ جاؤں، لاکھ برہم ہوں بڑوں کی برہمی بھی فائدہ ہی کے لئے ہوتی ہے ـــــ آؤ ہمّت!

بخت خاں دلاور علی خاں کے سامنے پہنچا تو وہ پیکرِ جلال بنے بیٹھے تھے ہمت تو بخت خاں کو پہنچا کر کھسک گیا، اب بخت خاں ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

بخت خاں۔ آپ اپنے راستے پر چلیئے، مجھے اپنے راستے پر چلنے دیں۔

دلاور علی خاں۔ یہ ناممکن ہے، میرے گھر میں وہ شخص نہیں رہ سکتا جو میرے آقاؤں کا دشمن ہو!

بخت خاں۔ میں بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتا، جہاں انگریزوں کی آقائی کا سکّہ چلتا ہو!

دلاور علی خاں۔ آج اگر بھائی زندہ ہوتیں، تو یہ باتیں تیرے مُنہ سے نکل سکتی تھیں، بول نالائق؟

بخت خاں۔ آج اگر والد مرحوم بھی زندہ ہوتے تو میں یہی کہتا جو کہہ رہا ہوں، اسلیئے کہ میرے دل میں آپ کی اتنی ہی محبت ہے جتنی اُن کی!!

دلاور علی خاں۔ جھوٹ، بالکل جھُوٹ۔

بخت خاں۔ میں آپ کی رائے نہیں بدل سکتا، لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔

دلاور علی خاں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی روش بدل دو، قلعہ کی نوکری چھوڑ دو میرے ساتھ چلو، میں تمہیں صاحب ریزیڈنٹ سے ملاؤں گا، وہ تمہیں تین سو روپے ماہوار دیں گے!

بخت خاں۔ وہ اگر تین لاکھ ماہوار بھی دیں ان کی ملازمت نہیں کر سکتا قلعہ میں مجھے فاقہ بھی کرنا پڑے، تو میں وہاں کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتا۔

دلاور علی خاں۔ تم دلّی کیوں آئے ہو؟ کمانے؟ یا فتنہ انگیزی کرنے؟

بخت خاں۔ میں کمانے آیا تھا، دنیا کمانے لیکن اب میں دُنیا سے بڑی چیز کما رہا ہوں، وہ چیز، جو انسان کو انسان بناتی ہے یعنی ملک، اور ملّت پر جان قربان کر دینا!

بخت خاں نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

دلاور علی خاں۔ بولو، جواب دو۔

بخت خاں اب بھی خاموش رہا۔

دلاور علی خاں۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں، میرے سوالات کا تمہارے پاس جواب کیوں نہیں؟

بخت خاں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکا، خاموش ہو گیا۔

دلاور علی خاں۔ کیا تم انگریزوں کو بے وقوف سمجھتے ہو، تم سمجھتے ہو، وہ تمہاری سرگرمیوں سے ناواقف ہیں؟ انہیں ایک ایک بات کی خبر ہے۔

بخت خاں۔ نہیں چچا جان، میں انگریزوں کو حد سے زیادہ چالاک سمجھتا ہوں وہ پاپی ہیں، ظالم ہیں، غاصب ہیں، بے ایمان ہیں، جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہیں، انہوں نے ہندوستان کی بہت سی ریاستوں پر قبضہ کر لیا، اب وہ دلّی کی بادشاہت بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں، اور جب تک بخت خاں اور اس کے ساتھی زندہ ہیں، ایسا نہیں ہو سکے گا!

دلاور علی خاں۔ خاموش، نالائق۔

بخت خاں۔ میں آپ کا خادم ہوں، آپ اگر جوتے بھی ماریں تو سر جھکاؤں گا۔ لیکن ایمان اور ضمیر کے معاملہ میں کہوں گا وہی جسے سچ سمجھتا ہوں۔

دلاور علی خاں۔ انگریزوں سے دشمنی کر کے تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔

بخت خاں۔ پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارتا، اُن کی گردن کاٹنا، اور اپنی گردن کٹوا دینا چاہتا ہوں! ——— میں انگریزوں سے نفرت کرتا ہوں چچا جان!

دلاور علی خاں۔ لیکن میں ان کا نمک خوار ہوں۔

تمناؤں کا مرکز، آرزوؤں کا مسکن تھا، خاموشی کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں جب اس کی نظر جمیلہ پر پڑی، تو آنسو بہنے لگے۔ جمیلہ اس کی کمر سے لپٹ گئی، اس نے آہستہ سے اسے ہٹایا اور

"خُدا حافظ"

کہہ کر باہر نکل گیا،!
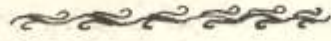
دلاور علی خاں۔ احمق، بے وقوف، پاگل،

بخت خاں نے کوئی جواب نہیں دیا، قدسیہ بیگم

یہ گرم گرم باتیں سن کر آموجود ہوئی، تھیں،

انہوں نے کہا:۔

"کیوں لڑکے کے پیچھے پڑ گئے ہو، آخر اس نے کیا کیا؟"

دلاور علی خاں۔ یہ انگریزوں کا دشمن ہے۔

قدسیہ بیگم۔ ہُوا کرے تمہیں کیا۔

دلاور علی خاں۔ میں ان کا نمک خوار ہوں۔

قدسیہ بیگم۔ تو تمہیں ان کا نمک کھانے سے کون منع کرتا ہے،!

دلاور علی خاں۔ میری نمک خواری کا تقاضا یہ ہے کہ میں ایسے شخص سے کوئی واسطہ نہ رکھوں جو میرے آقاؤں کا دشمن ہو، ابھی اور اسی وقت بخت کو فیصلہ کرنا پڑے گا، کہ وہ اپنی روش بدلتا ہے یا نہیں؟ ——— بتاؤ،

بخت خاں تم نے کیا فیصلہ کیا؟

بخت خاں۔ میں ابھی ابھی عرض کر چکا۔

دلاور علی خاں۔ یعنی تم قلعہ سے وابستہ رہوگے؟

بخت خاں۔ جی ہاں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔

دلاور علی خاں۔ تو میرا بھی یہ اٹل فیصلہ ہے کہ آج سے میرے تمہارے تعلقات ختم۔ میں اگر مر جاؤں تو تم میرے جنازہ پر نہ آنا، میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، نکل جاؤ یہاں سے، دُور ہو جاؤ میرے سامنے سے ——— نالائق ننگِ خاندان ———!

بخت خاں اپنے کمرہ میں گیا، کپڑے بدلے، اور اس گھر سے جو اس کی

فوج بغاوت پر کمر بستہ ہوتی تھی، وہ انگریز افسروں اور حاکموں کو قتل کر کے گورے سپاہیوں کا کامیاب مقابلہ کرنے اور انہیں کامل شکست دینے کے بعد دِلّی کا رُخ کرتی تھی۔[1]

بلاشبہ اس بغاوت اور شورش میں شہزادہ جواں بخت اور جنرل بخت خاں کی سعی و کوشش کو بہت زیادہ دخل تھا، لیکن عام حالات بھی ایسے تھے جنھوں نے غدر اور شورش کے لئے فضا پورے طور پر ساز گار کر دی تھی۔

عوام کے قلوب میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ انگریز بھارت کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کر لینا چاہتے ہیں، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دین کر دینا چاہتے ہیں، فوج کے کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی کا استعمال اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، فوج میں گوروں کی جو قدر و منزلت تھی، وہ جانباز سپاہیوں اور افسروں کی نہ تھی گوروں کو غیر واجبی ترقیاں ملتی تھیں، ان کی راحت و آسائش کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جاتا تھا، انہیں الگ سے الاؤنس اور بھتہ کے نام سے بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں طویل طویل چھٹیاں تنخواہ کے ساتھ دی جاتی تھیں، بلکہ لندن آنے جانے کا کرایہ بھی نذر کیا جاتا تھا وہ ہندوستانیوں کے ساتھ خواہ کیسا ہی ظلم و تشدد کریں، لوٹ مار کریں، قتل و غارت کے مرتکب ہوں، مگر ان سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی جاتی تھی اس کے برعکس دیسی سپاہیوں پر زیادہ سے زیادہ سختی روا رکھی جاتی تھی، انہیں گوروں کے مقابلہ میں تنخواہ کم ملتی تھی، کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ گوروں کے مقابلہ میں انہیں ذلیل کیا جاتا تھا حقیر سمجھا جاتا تھا، بجز کسی سبب کے برخواست کر دیا جاتا تھا، ذرا سی خطا پر لمبی لمبی اور کڑی کڑی سزائیں دی جاتی تھیں، آخر کو وہ کب تک یہ جفائیں سہتے؟ یہ سختیاں برداشت کرتے؟

---

[1] دِلّی کی جان کنی

آگ بھڑک اُٹھی

آخر وہ دن آگیا، جس کا اضطراب کے ساتھ سارے ہندوستان میں بالعموم اور دلّی میں بالخصوص انتظار کیا جا رہا تھا؟

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے بغاوت کا آغاز ہُوا، میرٹھ کے انگریزوں کو قتل کر کے بہت جلد ایک بہت بڑے جمِ غفیر کے ساتھ، ہندوستانی سپاہی دِلّی پہنچ گئے، سپاہیوں کے ایک حصّہ نے لال قلعہ کو گھیر لیا، اور دوسرے نے شہر کے انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے مزاحمت کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بہادر شاہ نے اس ہنگامہ آرائی سے اپنا دامن بچانا چاہا۔ لیکن نواب زینت محل، جواں بخت، اور بخت خاں کے دلائل نے انہیں قائل کر دیا، اور وہ عملی حصّہ لینے پر تیار ہو گئے۔ اس شرط کے ساتھ کہ کسی کو ناحق نہ مارا جائے، خواہ وہ انگریز ہو، ہندو ہو یا مسلمان۔

دوسرے دن لال قلعہ میں بادشاہ کا دربار ہُوا، یہاں جواں بخت کو وزارت کا منصب سونپا گیا، مرزا مغل کمانڈر انچیف بنائے گئے، اور بخت خاں کو لارڈ گورنر یعنی سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔

دلّی کی بغاوت کی خبریں بہت جلد سارے ہندوستان میں پھیل گئیں، جہاں کی

---

[1] دار کی سزا۔

لیکن مجمع کے ہاتھ سے بچکر کہاں جاتے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ فریزر، ہچنسن، شکاف اور کئی انگریز مارے گئے اور ہم

اس حادثہ نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے، اور وہ ایک محفوظ جگہ پر پناہ گزین ہو کر رسد اور کمک کا انتظار کرنے لگے، کیونکہ پنجاب غدر سے بالکل محفوظ تھا، اور وہاں سر جان لارنس سکھوں اور ہندوؤں کی فوجیں دلّی پر حملہ کرنے کے لئے مہاراجہ پٹیالہ مہاراجہ جنید اور دوسری ریاستوں کی مدد سے تیار کر رہے تھے، اور انہوں نے ان پناہ گزین انگریزوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں یقین دلایا تھا کہ دلّی بہت جلد فتح کر لی جائے گی۔

دلّی پر ایک مرتبہ پھر بہادر شاہ کی حکومت قائم ہوگئی، ان کے نام کا سکہ چلنے لگا، جنرل بخت خاں نے روپیہ کی کمی، وسائل و ذرائع کی کمزوری، اور حالات کی ناساعدت کے باوجود، بڑا اچھا انتظام کیا تھا، لیکن مرزا مغل اپنی ناتجربہ کاری سے حالات کو بگاڑ رہے تھے، انہوں نے کبھی میدان جنگ میں قدم نہیں رکھا تھا کسی جنگ میں شرکت نہیں کی تھی، کسی پلٹن کی رہنمائی نہیں کی تھی، کوئی مورچہ نہیں سر کیا تھا، وہ فوج کے نظم و ضبط سے اور اس کی اہمیت سے ناواقف تھے، وہ بخت خاں کی نظم پروری کا مذاق اُڑاتے تھے، وہ اندھادھند فوج میں اضافہ کر رہے تھے، اور ہر کس و ناکس کو ہتھیار تقسیم کر رہے تھے، چنانچہ تلنگوں (دیسی سپاہیوں) کے ساتھ بہت سے چمار، بھٹیارے، جلاہے، مفلس، قلاش، آوارہ، بدمعاش اور غنڈے بھی شامل ہو گئے، ان سب نے مل کر نظم و ضبط کا خاتمہ کر دیا، اور حالات بہت زیادہ ابتر کر دیئے، انہوں نے تمام تجارتی کوٹھیوں، بنکوں، خزانوں اور بڑے بڑے ساہوکاروں کو لوٹ لیا، سرکاری دفاتر، کچہری، کمشنری، عدالت،

---

[1] دلّی کی جان کنی۔

سارا دلّی، سارا ہندوستان، سارے ہندوستان کا ہر فرد ۱۰ مئی کا انتظار کر رہا تھا۔

بالآخر وہ تاریخ موعود آگئی، اور دفعتاً سارے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

دلّی میں دیسی سپاہی، انگریزوں سے زیادہ تھے، اور ان کی تعداد میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔

"باغی سوار، راج گھاٹ کے دروازے کی طرف سے دلّی میں داخل ہوئے۔ مسٹر فریزر (کمشنر دلّی) نے یہ دروازہ بند کرا دیا تھا تاکہ باغی اندر نہ گھسنے پائیں، لیکن بخت خاں نے پہلے سے اس کا انتظام کر رکھا تھا، چنانچہ جیسے ہی باغی سوار پہنچے، دروازہ کھل گیا، اور یہ سپاہی اور سوار "دین دین" کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کے اندر گھس آئے، اور انہوں نے انگریزوں سے ان کی سفاکیوں اور ظلم آرائیوں کا انتقام لینا شروع کر دیا، اس وقت کوتوالی میں مسٹر فریزر (کمشنر) سر طامس مٹکاف (ریزیڈنٹ) ہچنسن (ڈپٹی کمشنر مجسٹریٹ) اور بہت سے انگریز جمع تھے اور صورتِ حالات کے تدارک پر غور کر رہے تھے۔ اتنے میں باغی سواروں اور دل جلے شہریوں نے کوتوالی کا محاصرہ کر لیا، فریزر صاحب نے ایک سپاہی سے پوچھا،

"تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟"

سپاہی نے جواب دیا: "ہم دھرم اور دین کا ساتھ دیں گے، تمہارا یا کسی اور کا نہیں!"[1]

یہ بات سُن کر فریزر صاحب کو غصّہ آگیا، انہوں نے گولی سر کر دی، سوار گھوڑے سے گر پڑا، اور فوراً مر گیا، یہ دیکھ کر وہ مجمع جواب تک آپے سے باہر نہیں ہوا تھا بپھر گیا، اس نے ایک زوردار نعرہ لگایا اور حملہ کر دیا، یہ دیکھ کر سارے انگریز بھاگے

[1] تاریخ ہند، ذکاء اللہ۔

حوصلے بہت بڑھ گئے تھے، چنانچہ اس روز شام کے قریب باقی لوگ ساٹھ انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، گرفتار کر کے لائے، اور قیدیوں کی طرح بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا، ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا سخت گناہ ہے، انہیں فی الحال قلعہ کے قید خانہ میں محبوس کر دیا جائے، ان کی خبر گیری کی جائے اور کھانے پینے کی ذرا بھی تکلیف نہ ہونے پائے۔ سلہ

اس طرح بادشاہ نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔

اور ایک بادشاہ ہی پر کیا موقوف ہے، بہت سے مسلمان ایسے تھے جنہوں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی، اپنی عزت وآبرو کی پروا نہ کی، اپنے زر و مال کو قربان کر دیا لیکن جن انگریز عورتوں یا بچوں کو پناہ دی تھی، انہیں ویسی فوج کے حوالہ نہیں کیا، وہ سپاہی جو چھاؤنیوں سے نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر آئے تھے۔ اور انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکے تھے، خار کھائے بیٹھے تھے انگریزوں کی صورت دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا، وہ بے قابو ہو جاتے تھے، اور مرد و زن کی تفریق کئے بغیر تلوار سونت کر ایک ہی وار میں فیصلہ کر دینا چاہتے تھے، لیکن ایسا بہت کم ہو پایا۔ اس لئے کہ جہاں پناہ، جواں بخت اور بخت خاں سختی سے اس اصول پر قائم تھے کہ بے گناہوں کی جان نہ لی جائے اور بچوں اور عورتوں کو تو کسی طرح قتل نہ کیا جائے، مرزا مغل چونکہ بالکل فوج کے ہاتھ میں تھے، لہٰذا وہ اس تجویز کی مخالفت کرتے تھے اور چاہتے تھے کسی انگریز کو زندہ نہ چھوڑا جائے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا بہرحال دلّی پر قبضہ کے دوران میں جو انگریز ہلاک ہوئے وہ تو ہوئے لیکن فیصلہ کے بعد بہت کم انگریزوں کی جان لی گئی، باقی ماندہ انگریز یا تو دلّی سے محفوظ مقامات کی طرف بھاگ

سلہ۔ دلّی کی سزا۔

فوجداری، اور کچہری صدرالصدور و منصفی وغیرہ میں آگ لگادی، تمام نقد و جنس جو ہاتھ لگا لوٹ لیا، دستاویزیں، اور کاغذات پھاڑ ڈالے، سڑکوں پر شیشے کی جولالٹینیں لگی تھیں توڑ ڈالیں، ان کے کھمبے اُکھاڑ دیئے، سارے شہر میں اندھیرا چھا گیا، قلعہ اور میگزین پر اپنا پہرہ لگادیا۔

یہ حالات دیکھ کر بخت خاں بگڑ گیا، اس نے جواں بخت سے کہا۔

" صاحب عالم، میرا استعفےٰ قبول فرمایئے!"

جواں بخت نے اسے تسلّی دی اور کہا۔

" گھبراؤ مت، حالات جلد دُرست ہوجائیں گے، میں صاحب عالم مرزا مغل سے عرض کروں گا کہ وہ فوجی معاملات اور شہر کے نظم کے سلسلہ میں تمہاری ہدایت اور مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھائیں!"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ صاحب عالم مرزا مغل، جواب دیسی فوج کے سپہ دار اعلےٰ (کمانڈر انچیف) تھے تشریف لائے، جواں بخت نے جیسے ہی یہ بات چھیڑی انہوں نے نہایت حقارت سے بخت خاں کی طرف دیکھا، اور جواں بخت کو مخاطب کر کے کہا،

" میں، ان فتنہ پردازیوں کو پسند نہیں کرتا، جو مناسب سمجھوں گا، وہ کرونگا، میں کمانڈر انچیف ہوں، سب کو میری اطاعت کرنی چاہیئے، اور میری اطاعت نہیں کرے گا، اس سے میں سمجھ لوں گا، خواہ وہ اپنے وقت کا "لارڈ" ہی کیوں نہ ہو!"

یہ کہہ کر برہمی کے عالم میں وہ تشریف لے گئے، بخت خاں اور جواں بخت حیرت سے ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

بخت خاں کی بے بسی، اور مرزا مغل کی بے پروائی سے تلنگوں، اور آفاقیو نکے

لہ صغیر کا ترجمہ۔

جواں بخت، اور بخت خاں کی محنت، مرزا مغل کی خودرائی، خودپسندی، اور مطلق العنانی کے باعث اکارت ہوتی نظر آرہی تھی، اگر سارا دروبست بخت خاں کے ہاتھ میں رہتا جیسا کہ شروع میں تھا، تو اب تک دیسی فوجیں سارے ہندوستان پر قابض ہو چکی ہوتیں، لیکن دوعملی نے حالات اتنے ابتر کر دیئے تھے کہ اب دلّی پر قبضہ رکھنا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

بخت خاں کی ہر اسکیم مرزا مغل اُلٹ دیتے تھے، انہوں نے دلّی پر قبضہ کے بعد یہ خیال کر لیا کہ اب سارا ہندوستان قبضہ میں ہو گیا ہے، اگرچہ جنگ کے میدان میں خاک و خون کا ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا وہ عیش و عشرت میں منہمک رہنے لگے تھے معاملاتِ حکومت کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے، ان لوگوں کو ترقی دے کر بڑے بڑے مناصب پر پہنچا دیا تھا جو بالکل نکمّے اور ناکارہ تھے، بخت خاں کی ایک نہ چلنے پاتی تھی، اس کی ہر تجویز، ہر اسکیم رد کر دی جاتی تھی، جواں بخت بخت خاں سے زیادہ بے بس تھا، بخت خاں تو کبھی کبھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا لیکن جواں بخت بھائی کے ادب و احترام کے باعث خاموش رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ بخت خاں اور جواں بخت کنارہ کش ہو گئے تھے، سارا بندوبست مرزا مغل کے ہاتھ میں تھا۔

گئے۔ یا دآئی میں انگریزوں کی جو پناہ گاہ تھی وہاں اطمینان اور آرام سے مقیم ہو گئے۔ البتہ ان بنیوں اور ساہوکاروں کی شامت ضرور آئی جو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے، اور جنہوں نے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں اپنی زیادہ گراں کر دی تھیں کہ شہری تو شہری، فوجی سپاہی بھی انہیں نہیں خرید سکتے تھے ؛
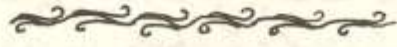
اور دیسی سپاہیوں کو خاصا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

۱۴ ستمبر کو فیصلہ کُن جنگ ہوئی، اور اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز دِلّی پر قابض ہو گئے۔

سب سے پہلے ساٹھویں رائفل غل مچاتی آگے بڑھی، اسی وقت قدسیہ باغ سے جنرل نکلسن نے اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور شہر پناہ کے شگافوں کی طرف چلنا شروع کیا، باغیوں نے یہ دیکھ کر زوردار مقابلہ شروع کر دیا، گولوں اور گولیوں کا ایسا مینہ برسایا کہ انگریزی فوج حواس باختہ ہو گئی، بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے لیکن اتنی دیر میں سیڑھیاں آگئیں اور فصیل سے لگا دی گئیں، سب سے پہلے جو شخص فصیل پر چڑھا، وہ خود جنرل نکلسن تھا، پھر تو انگریزوں اور دیسی سپاہیوں کا تانتا لگ گیا۔

اسی اثنا میں چوتھا کالم، سبزی منڈی سے کشن گنج اور پہاڑ گنج کی طرف حملہ آور ہوا، نکلسن صاحب کے حکم سے فوج کا ایک حصّہ اجمیری دروازے کی طرف گیا، ایک اور حصّہ کو کابلی دروازہ کے رُخ سے جامع مسجد کی طرف جانے کا حکم ملا کابلی دروازے پر انگریزی جھنڈا گاڑ دیا گیا، اس معرکہ میں نکلسن صاحب کی چھاتی میں گولی لگی اور وہ گر پڑے۔

فوج کا ایک حصّہ سر طامس مٹکاف کے ماتحت تھا، یہ دِلّی کے کلکٹر اور مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ لہٰذا شہر کے راستوں سے خوب واقف تھے، اپنی فوج کو ایسے راستے سے لے گئے، جہاں دشمن کی آتش بازی بہت کم تھی، وہ جامع مسجد تک پہنچ گئے، جہاں آج کل ڈفرن اسپتال ہے وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے، اسوقت ہزاروں مسلمان نماز کے لئے مسجد میں جمع تھے، انہیں معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اڑا دینا چاہتے ہیں، ان سب کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہ تھیں ایک آدمی

اِدھر تو یہ کیفیت تھی، اُدھر قلعہ کی ایک ایک بات کی تفصیلی اطلاع مرزا الٰہی بخش کے ذریعہ انگریزوں تک پہنچتی رہتی تھی۔

انگریز الٰہی بخش کے بھیجے ہوئے معلومات سے پُورا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ان کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں، انہوں نے پنجاب کے والیانِ ریاست کو انعام کا لالچ دے کر ہموار کر لیا تھا، حال ہی میں انہوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تھا، اور اتنی سفاکی کے ساتھ کہ لوگوں کے دلوں پر دہشت بیٹھ گئی تھی، چنانچہ بہ حیثیت مجموعی پنجاب ہر قسم کی ہنگامہ آرائی سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ اس نے ان کی اطاعت سے سرِمو انحراف نہیں کیا، سرجان لارنس بیدار مغز اور مدبّر شخص تھا، اس نے بھی پنجابیوں کو اس طرح اسیرِ دام کیا کہ وہ اس کے ہو رہے، حد یہ ہے، کہ ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ مسلمانوں کی بھی ایک خاصی تعداد انگریزی لشکر میں شریک ہو گئی تھی کہ دِلّی پر جا کر حملہ کرے، اسے فتح کرے، اور انگریزوں کے حوالہ کر دے۔

"۶ ستمبر کو انگریزوں کی تمام سپاہ جو کمک کے لئے آسکتی تھی مجتمع ہو گئی"۔

۸ ستمبر کو انگریزوں نے دھاوا کیا۔ اور لڈلو کاسل فتح کر لیا، جو کشمیری دروازہ سے صرف ۵۰۰ گز کے فاصلہ پر تھا، اور جہاں کشمیری دروازہ سے نکل نکل کر باغی سپاہی انگریز مورچوں پر دھاوے کیا کرتے تھے جنگی نقطۂ نظر سے اس مقام کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔

۱۱ ستمبر کو انگریزوں اور باغیوں کے درمیان توپ خانہ کی جنگ ہوئی، اس زور شور سے گولہ باری ہوئی کہ زمین آسمان لرزنے لگے۔ اس معرکہ میں انگریزوں

لہ یہ فوج ساڑھے چھ ہزار پیدل، ایک ہزار سواروں، اور چھ سو توپچیوں پر مشتمل تھی۔ اس میں گورے صرف تین ہزار تھے، باقی ہندو، سکھ اور مسلمان سپاہی تھے۔ دلّی کی جان گئی!

زمانہ کا انقلاب اسی طرح کروٹیں لیتا ہے،!

۱۱ مئی کو دِلّی انگریزوں سے چھن گئی تھی، ۱۴ ستمبر کو پھر ان کے قبضہ میں آگئی۔

جب انگریزوں کو شکست دے کر مسلمانوں نے دِلّی پر قبضہ کیا تھا، تو وہ امید و آرزو کے نشہ سے سرشار تھے، ان کے حوصلے بلند تھے، ان کے عزائم میں آسمان کی رفعت تھی، یہ جذبہ اگر قائم رہتا، تو کوئی شبہ نہیں، وہ بڑی آسانی سے سارے بھارت پر قبضہ کر لیتے، کیونکہ انگریز سراسیمہ ہو چکے تھے، ان کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، ان کی ہمت جواب دے چکی تھی، لیکن مسلمانوں نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا انہوں نے دِلّی پر قبضہ کیا اور اپنے آپ کو مطمئن کیا کہ اب سارا ہندوستان ہماری مٹھی میں ہے اور آپس میں لڑنے لگے، ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو شک و شبہ اور حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

ان حالات نے بددِلی پیدا کی، بددلی نے مایوسی کی صورت اختیار کی، کمانڈر انچیف سپریم کمانڈر کو اپنا رقیب اور حریف سمجھنے لگا۔ بادشاہ کے دل میں سپریم کمانڈر کے خلاف مسلسل جذبۂ مخالفت پیدا کیا گیا، زینت محل اور جواں بخت کو بے بس بنا دیا گیا، جاسوس، غدّار، اور مخبر قلعہ میں بیٹھ کر انگریزوں سے نامہ و پیام کرنے لگے، ان باتوں کا نتیجہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا کہ دشمن موقع سے فائدہ اُٹھاتے، اور ایسا کاری وار کرے کہ پھر کسی میں اس سے نبرد آزما ہونے کی ہمّت اور سکت باقی نہ رہ جائے چنانچہ یہی ہوُا، جیتے ہوئے ہار گئے اور جو ہار چکے تھے وہ پھر جیت گئے۔

تلك الايّام نداولها بين النّاس

مکبّر پر چڑھا، اور اس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا۔

"تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ انگریزوں کا مقابلہ اپنی باغی فوج سے تھا، مگر اب وہ تمہاری مسجد کو ڈھانے چلے ہیں، میں تم کو مرنے کا بلاوا دیتا ہوں، دشمن سامنے کھڑا ہے، جسے مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازے کی طرف آئے جسے جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازے کی طرف چلا جائے۔ کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔

یہ تقریر سُنکر مسلمانوں نے تکبیر کا بلند کیا، ایک آدمی بھی جنوبی دروازہ کی طرف نہیں گیا، سب نے میانوں سے تلواریں کھینچ لیں، پھر وہ شمالی دروازے کی طرف دوڑے جیسے ہی دروازے سے باہر نکلے ہڈکاف صاحب نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری، جس سے دوسو آدمی شہید ہو کر گرے، اور مسجد کی سیڑھیاں ان کی لاشوں سے پٹ گئیں، مگر مسلمان اس پھرتی سے دوڑے کہ دوسرا گروپ مارنے کی ہڈکاف صاحب کو مہلت نہ ملی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی شروع ہو گئی ہڈکاف صاحب ان پرجوش دیوانوں کا مقابلہ نہ کر سکے چنانچہ مع اپنی فوج کے بھاگ کھڑے ہوئے[1]

فوج کی کمان اب جنرل ولسن کے ہاتھ میں تھی، کیونکہ نکلسن بستر مرگ پر دراز تھا اس نے تمام فوج مجتمع کر کے ایک زوردار حملہ کیا، اور بالآخر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلی پر قبضہ کر لیا، لیکن ابھی شہر میں ہتھیار بند دشمن کہیں کہیں موجود تھا لہٰذا دلی پر قبضہ کے باوجود جنگ ۱۹ ستمبر تک جاری رہی، اس تاریخ کو مکمل طور پر شہر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

---

[1] کیمبل صاحب جو اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے، کہتے ہیں کہ اگر مجھ کو کمک پہنچ جاتی، اور بارود کے تھیلے میرے پاس آجاتے تو میں جامع مسجد دہلی کو اس دن ضرور اڑا دیتا۔"
(دلی کی جان کنی)

تھا جس میں رحم تو رحم، انصاف کا گذر بھی نہیں تھا، یہاں خطاکار اور بے خطا، گنہگار اور معصوم، طرفدار اور مخالف، سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا یہاں جو آتا تھا وہ گردن سلامت لے کر واپس نہیں جا سکتا تھا، یہاں جو موجود تھا۔ وہ زندگی سے مایوس تھا نفسی نفسی کا عالم تھا، کوئی کسی کا دوست نہیں تھا، ساتھی نہیں تھا جو پسینہ پر خون بہانے کے مدعی تھے وہ اب سایہ سے بیزار تھے، جنہیں جاں نثاری کا دعویٰ تھا، وہ اب صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے، !

انقلاب، تغیر!

یہی دُنیا کی ریت ہے یہی دنیا والوں کی عادت ہے،

اور لال قلعہ؟

شوکت چنگیزی، اور عظمت تیموری کا آخری مرکز، لال قلعہ کس حال میں تھا؟

وہی لال قلعہ، جو بجائے خود ایک دنیا تھا، جہاں شہزادوں اور مرشدزادوں کو حویلیاں تھیں، محل تھے، خدم و حشم تھے، جہاں ہندوستان بھر کے راجہ، اور نواب سر جھکا کر نگاہ نیچی کئے آتے تھے، اور حضور شاہی میں نذر پیش کر کے نازاں و شاداں واپس چلے جاتے تھے، جہاں انگریز ریزیڈنٹ اور گورنر بھی سر کے بل حاضر ہوتے تھے مجرا اور آداب اور کورنش بجالاتے اور نذریں پیش کرتے تھے، آج کس حال میں ہے؟

ہر طرف مرگ آسا سکوت چھایا ہوا تھا؟

سوئی بھی گرے تو اس کی آواز کان کے پردے سے ٹکراتی محسوس ہو!

قلعہ کے محل خالی ہو چکے تھے، حویلیاں سنسان نظر آرہی تھیں، رونق دم توڑ چکی تھی، زندگی راہ فرار اختیار کر چکی تھی۔

لال قلعہ اب ایک ویرانہ تھا۔

انقلابات ہیں زمانہ کے

ساری دلّی پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا،!
موت، ہلاکت، بربادی، اور دہشت کا سنّاٹا،!

وہ عزائم رخصت ہو چکے تھے، جنہوں نے نہتّوں کو رستم و اسفندیار بنا دیا تھا، وہ جذبہ سرد پڑ چکا تھا، جو نامردوں کو بھی مرد بنا دیتا ہے، وہ حوصلہ دم توڑ چکا تھا، جو ذرّے کو آفتاب بنا دیتا ہے، وہ آن سسک رہی تھی جس نے نسلِ تیمور میں تخت یا تختہ کا سودا پیدا کر دیا تھا۔

ہر شخص سراسیمہ تھا، مضطرب تھا، پریشان تھا۔

اب کیا ہوگا؟

یہ سوال تھا جو ہر شخص کے دل میں، ہر شخص کی زبان پر، ہر شخص کے دماغ میں چکر کاٹ رہا تھا، بے رحم، سفّاک، خون آشام، اور درندہ صفت دشمن اب فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو رہا تھا، اس نے جب پہلے اقدار انسانی کا لحاظ نہیں کیا تو اب کیا کرے گا؟ پہلے یہ بہر حال فاتح نہیں تھا، اب اس کی فیروز مندی اور خوش طالعی ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

امیر اور غریب، گنہگار اور بے گناہ، بادشاہ کے طرفدار اور انگریزوں کے غمگسار، سب بیدِ لرزاں کی طرح کانپ رہے تھے، یوم الحساب سامنے تھا، اور یہ ایسا یوم الحساب

یہ محل کی رہنے والیاں، یہ عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے والیاں، یہ ہر وقت نشاط و مسرت سے بے خود رہنے والیاں، اور راگ رنگ کی دلچسپیوں میں کھوئی ہوئی رہنے والیاں بھی بے تحاشہ بھاگ رہی تھیں،

یہ وہ تھیں، جنہوں نے کبھی محل کی چہار دیواری سے قدم باہر نہیں نکالا جنہوں نے غیر مردوں کی صورت نہیں دیکھی جنہیں پھولوں کی سیج مخمل کے بستر، کمخواب کے تکئے سے بھی آرام نہیں ملتا تھا جنہوں نے کبھی دو قدم پاپیادہ چلنے کی زحمت نہیں گوارا کی، جن کی خدمت اور چاکری کے لئے، ہر وقت کنیزوں اور غلاموں کے پرے کے پرے دست بستہ حاضر رہتے تھے جن کے ایک اشارۂ چشم پر، ہر چیز موجود ہو جایا کرتی تھی جن کے منہ سے کوئی بات ایسی نہیں نکلی جو پوری نہ ہوئی ہو، اور آج یہ شہزادیاں، پاپیادہ، بے یار و مددگار، رات کی تاریکی میں، لڑکھڑاتی، ہانپتی کانپتی ویران سڑکوں پر کنکروں سے ٹھوکر کھاتی، گڑھوں میں سے گزرتی نہ معلوم کہاں چلی جا رہی تھیں، !

کسی کو سرپاؤں کا ہوش نہیں تھا، کوئی کسی کے ساتھ نہیں تھا۔

ہر شخص، خود اپنا قافلہ اور خود اپنی منزل تھا، !

بادشاہ سلامت جو آج کے بعد پھر کبھی بادشاہ سلامت نہیں کہلائیں گے، بڑی مشکل سے زینت محل اور جواں بخت کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچے، دو روز کے فاقہ سے تھے، بڑھاپے اور بیماری نے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا، فاقوں نے حالت اور ابتر کر دی، یہاں آ کر فاتحہ پڑھی، دو سوکھی روٹیاں کھانے کو ملیں جس شخص کے دسترخوان پر آج سے پہلے، دنیا کی ہر نعمت موجود ملتی تھی جس کے رکابدار اور باورچی ایسی ایسی لذیذ چیزیں تیار کرتے تھے، کہ بڑے بڑے والیانِ ریاست انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے، جس کے دسترخوان پر شہزادوں، مرشد زادوں، امیروں، حاکموں اور

جو حکومت چھیننے کا حوصلہ لے کر آگے بڑھے تھے، وہ آج زندگی کی تلاش میں ہر ذلّت گوارا کر رہے تھے۔ جن کے اسلاف نے میدانِ جنگ سے کبھی مُنہ نہیں موڑا تھا، انہی کے اخلاف آج زندہ رہنے کے لئے میدانِ جنگ سے بھاگ رہے تھے، جن اجداد نے ہمّت، حوصلہ، جوش اور جذبۂ دارائی سے کام لیا، ایک غیر ملک سے آکر اس وسیع و عریض مُلک کو جاہ و جلال اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ فتح کیا تھا، یہ انہی اجداد کے باقیات تھے جو پیٹھ دکھا کر بھاگ رہے تھے، اور مڑ کر نہیں دیکھتے تھے،

بابر اور ہمایوں، اکبر اور جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کی روحیں عالمِ بالا سے یہ دلخراش اور دلدوز نظارہ دیکھ رہی تھیں، اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں،!

یہ بھاگنے والے، پناہ طلب کرنے والے زندگی کا چارہ تلاش کرنے والے انہی کی اولاد تو تھے،!

شاہجہان کے عزم و ہمت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک نئی دِلّی بسائی[۱]، جامع بنائی، لال قلعہ تیار کیا، اور شاہجہان کی اولاد آج دِلّی سے ناتہ توڑ کر، جامع مسجد کو بے یار و مددگار چھوڑ کر، لال قلعہ سے مُنہ موڑ کر، ایک نامعلوم منزل کی سمت بھاگی جا رہی تھی، کسی کو نہیں معلوم تھا ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں؟ جدھر مُنہ اُٹھا چل دیئے، جدھر راستہ ملا ہو لئے۔

اور اس قافلہ میں مرد ہی نہیں تھے، عورتیں بھی،!

نہیں عورتیں نہیں شہزادیاں!

---

[۱] موجودہ دِلّی کا نام شاہجہان آباد ہے اور یہ شاہ جہان کی تعمیر او رتیار کی ہوئی ہے۔

ماں کہتی، بنو میں جلتی نہیں، شوق سے آرام کرو خدا تم کو ہمیشہ سُکھ کی نیند سلاتا رکھے میرا مطلب تو یہ ہے کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو سوتی ہو تو سویرے ذرا جلدی اُٹھا کرو مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں، گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے، لونڈیاں ڈر کے مارے بات بھی نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی ایسا بھی کیا سونا آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیئے اب ماشاء اللہ تم جوان ہوئیں پرائے گھر جانا ہے اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گذارا ہوگا،

گل بانو ماں کی یہ تقریر سُنکر بگڑتی اور کہتی کہ تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے۔ ہم سے نہ بولا کرو ہم دوبھر ہو گئے ہیں صاف صاف کہہ دو، دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ مرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کا بیٹا گل بانو کے پاس آنے جانے لگا قلعہ میں باہمی پردے کا دستور نہ تھا یعنی شاہی خاندان کے لوگ آپس میں پردہ نہ کرتے تھے اس واسطے مرزا داور کی آمد و رفت بے روک ٹوک ہوتی تھی۔

پہلے تو گل بانو اور داور بہن بھائی تھے چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا، مرزا گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے گل بانو داور کو ظاہری قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت مرزا گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا بانو سیاہ دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں منہ کھلا ہوا ہے اور اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے تکیہ الگ پڑا ہے دونوں لونڈیاں مکھیاں اُڑا رہی ہیں۔

وزیروں کا جمگھٹ رہتا تھا، جو دوسروں کو کھلائے بغیر کبھی ایک لقمہ نہیں توڑتا تھا وہی آج اپنی وفادار، بیوی اور بدنصیب لڑکے کے ساتھ یہ روکھی سوکھی روٹیاں آل نوش کرکے کھا رہا تھا، جیسے اس سے بڑھ کر لذیذ کھانا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

درگاہ میں بادشاہ نے ایک صندوقچہ پیش کیا، جس میں آنحضرت کا موئے مبارک تھا۔ اور بڑی حسرت کے ساتھ کہا:۔

"آج تک یہ امانت، میرے خاندان میں محفوظ رہی، اب میرا خاندان زمانہ نے تتر بتر کر دیا، میں اب اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا، لہٰذا، اس سبب سے بڑی بارگاہ کو یہ امانت سونپتا ہوں۔"

اور عین اس وقت جب بادشاہ یہ امانت سونپ کر ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ لینے پہنچ کر اپنے حالِ زار کا جائزہ لے رہے تھے درگاہ حضرت چراغ دہلی[1] کے ایک گوشہ میں ایک خوبصورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی، سردی کا مینہ دھواں دھار برس رہا تھا تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس عورت کا بستر تھا یہ گل بانو تھی بہادر شاہ کی پوتی داراب شاہ کی لڑکی۔

جب گل بانو کے پندرھویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دلربائی کی شوخیاں اس قسم کی پیدا کیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا سونے کے چھپر کھٹ پر دو شالہ تانے سویا کرتی تھیں، شام کو چراغ جلا اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں، ماں کہتیں چراغ میں بتی پڑی لاڈو پلنگ چڑھی تو وہ مسکرا کر انگڑائی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتیں اچھا بی تم کو کیا، سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں تمہارا کیا لیتے ہیں تم ناحق کو ٹکڑوں پر لوٹی جاتی ہو۔

---

[1] دلّی کی جان گئی [2] دلّی کی جان گئی۔

درد سے میرا سانس رُکا جاتا ہے،

جب کوئی اس آواز پر بھی اُس کے پاس نہ آیا تو اُس نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا اندھیرے دلان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہُوا تھا مینہ برس رہا تھا بجلی چمکتی تھی، تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی جو اس کے باپ کی تھی۔

یہ حالت دیکھ کر گل بانو نے ایک نعرہ مارا اور کہا، بابا تمہاری گل بانو ہوں دیکھو اکیلی ہوں، اُٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے مجھے سردی لگ رہی ہے، میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں، میری ماں مجھ سے بچھڑ گئی میں محلوں سے جلا وطن ہو گئی، بابا اپنی قبر میں مجھ کو بلا لو اچھی مجھے ڈر لگتا ہے کفن سے مُنہ نکالو اور مجھ کو دیکھو میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں، میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں میرا چھپر کھٹ کیا ہُوا میرا دوشالہ کہاں گیا میری سیج کدھر گئی، ابا، ابا جی اُٹھو کب تک سو ؤ گے ہائے درد اُف وہ سانس کیونکر لوں، ؟

دفعتاً آنکھ کھل گئی اور بیچاری بانو ایڑیاں رگڑنے لگی سکرات کا عالم شروع ہو گیا اور وہ کہتی تھی لو صاحب میں مرتی ہوں کون میرے حلق میں شربت ٹپکائے گا، کون مجھے یٰسین سُنائیگا کس کے زانو پر میرا سر رکھا جائے گا، الٰہی تیرے سوا میرا کوئی نہیں تو ایک ہے تیرا حبیب (صلعم) میرا مونس و رفیق ہے اور یہ چراغ اولیا میرے پڑوسی

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ

شہزادی مر گئی اور دوسرے دن گورِ غریباں میں گڑ گئی اور وہی اس کا ابدی چھپر کھٹ بن گیا جس میں قیامت تک سوتی رہے گی ❊

❊❊❊❊❊❊

داآور کو چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا مگر کن آنکھوں سے گل بانو کا یہ عالم مخموری دیکھتا جاتا تھا آخر نہ رہا گیا اور بولا کیوں چچی حضرت بانو اتنے دن تک سوتی رہتی ہیں، دھوپ قریب آگئی اب تو ان کو جگا دینا چاہیئے چچی نے کہا بیٹا بانو کے مزاج کو جانتے ہو کس کی شامت آئی ہے جو ان کو جگائے آفت بر پا ہو جائے گی۔ داآور نے کہا دیکھئے میں جگاتا ہوں دیکھوں کیا کرتی ہیں چچی ہنس کر بولیں جگا دو تم سے کیا کہیں گی تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں، داآور نے جا کر تلوے میں گدگدیاں کیں بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا اور بے اختیار آنکھ کھول کر نگاہِ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا، خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے اسکو گستاخی کی سزا دینی چاہیئے مگر جب اُس نے اُس شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اس کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اُس نے دوشالے کا آنچل منہ پر ڈال لیا اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھی، داآور نے ہوش پاس منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چیخ کر بولا، لو چچی حضرت میں نے بانو کو اُٹھا بٹھایا۔

محبت نے بہت ترقی کی مکتبِ عشق کی ابجد ختم ہو گئی اور درسِ ہجر و وصل کے شکوے پڑھے جانے لگے۔

آخر کچھ دنوں بعد بانو کی داآور سے شادی ہو گئی۔

غدر میں دوسرے شہزادوں کے ساتھ داآور بھی مارا گیا۔ اور گل بانو زمانہ کی سختیاں سہنے کے لئے زندہ رہ گئی۔

آج یہی گل بانو سخت بیمار تھی پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی، بخار کی بے ہوشی میں اُس نے آواز دی گلبدن اری او گلبدن، کہاں مر گئی جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اُوڑھا دے دیکھ تو پوچھار اندر آئی ہے تو وہ چھپندر ہے۔ اِدھر آ گلبدن تو کہاں غارت ہو گئی میرے پاس کوئلہ کی انگیٹھی اور پسلی پر تیل مل اُے

ساتھ ہے۔

بہادر شاہ۔ نہیں بخت خاں وہ تو ہمارے ساتھ کبھی بھی نہ تھا، وہ ساتھ ہوتا، تو یہ روزِ بد کیوں دیکھنا پڑتا؟

بخت خاں۔ ہر شخص کی نظر آپ کی ذات اور آپ کے حکم پر لگی ہوئی ہے، آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں، میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی وہاں نہ آسکے گا؟

مرزا الٰہی بخش۔ جو بستے ہیں وہ گرجتے نہیں، ان دعووں کی حقیقت معلوم ہے۔

بخت خاں۔ دہلی پایۂ تخت ہے، فوجی قلعہ نہیں، لڑائی کے لئے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے، اتنے دنوں جو ہم نے شہر کو بچائے رکھا یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارا شہر نشیب میں تھا، اور انگریز پہاڑی پر تھے، کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچے پر ہوتی تو اس کے لئے دہلی کا فتح کر لینا کوئی دشوار کام نہ ہوتا۔

بہادر شاہ۔ مرزا صاحب بخت خاں کی باتیں آپ نے سنیں، کیا رائے قائم کی۔؟

مرزا الٰہی بخش۔ میری رائے میں تو ان باتوں سے دغا کی بُو آتی ہے۔

بخت خاں۔ مرزا صاحب صرف جہاں پناہ کا پاس خاطر ہے، ورنہ میری تلوار اس جھوٹ کا جواب آپ کو دیتی۔

مرزا الٰہی بخش۔ وہ تلوار اگر ایسی کارگذار ہے، تو انگریزوں کے مقابلہ میں کیوں نہیں چلی،؟ انگریزوں کی سرکوبی اس نے کیوں نہیں کی؟

بخت خاں۔ اسے انگریزوں کے دل سے پوچھو،

بہادر شاہ۔ بخت خاں، ہم تمہاری وفاداری کے قائل ہیں۔

بخت خاں۔ مکرر عرض کرتا ہوں، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، تمام ہندوستانی ریاستیں

ھمایوں کا مقبرہ

بہادر شاہ جب قلعہ سے ہمایوں کے مقبرے جا رہے تھے، تو بخت خاں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، مگر بادشاہ نہ رُکنے کا فیصلہ کر چکے تھے، در حقیقت یہ فیصلہ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کا تھا۔

پھر جب بادشاہ، ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ گئے، تو بھی دو روز تک بخت خاں کی ہیبت کے باعث انگریزوں کے بیہمت نہ پڑی کہ وہ بادشاہ پر ہاتھ ڈالتے مرزا الٰہی بخش ہر وقت انہیں یہی مشورہ دیتے رہتے تھے کہ اب بخت خاں کا خیال دل سے نکال دیں اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیں، بادشاہ بخت خاں کے ساتھ تو نہیں گئے، لیکن اب تک اپنے آپ کو اس پر بھی آمادہ نہ کر سکے کہ انگریزوں کے پاس چلے جائیں۔

بخت خاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا، اس نے عرض کیا۔

بخت خاں۔ جہاں پناہ نے غلام کا کہنا نہیں مانا، قلعہ چھوڑ دیا، اور مقبرے میں تشریف لے آئے۔

بہادر شاہ۔ خاں — یہ ہم نے نہیں کیا، مقدر کے کرشمے ہیں۔

بخت خاں۔ جہاں پناہ اب بھی وقت نہیں گیا ہے اب بھی ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، اگرچہ انگریزوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا ہے لیکن سارا ہندوستان ہمارے

بہادر شاہ۔ لیکن ہمیں اُمید نہیں کہ اب حالات سدھر سکیں گے۔

بخت خاں۔ یہ نہ کہئے جہاں پناہ، ان الفاظ میں مایوسی کا داغ جھلکتا ہے جہاں پناہ سے یہ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے بزرگوں نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں کا مقابلہ کیا ہے شہنشاہ بابر بعض وقعہ دشمنوں میں ایسے گھرے کہ بجز بھاگنے کے سوا چارۂ کار نہیں رہا تھا شہنشاہ ہمایوں کو کیسی شکست اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ مگر ان کے استقلال نے ہر دشواری کو فتح کر لیا جہاں پناہ آپ بھی اسی بزمِ عالم افروز کی شمع ہیں تمام ہندوستان آپ کے جھنڈے تلے، مرنے مارنے کو تیار ہے، چلئے میرے ساتھ چلئے ظلِ سبحانی کامیاب کامران واپس آئیں گے!

بہادر شاہ۔ تمہارے ان الفاظ نے ہم میں بھی ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی ہے سچ کہا ہے شاعر نے ؎

مرد باید کہ ہراساں نہ شود
نیست، آساں نہ شود

اگر کوشش کی جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے!

بخت خاں۔ بے شک جہاں پناہ، سب کچھ ہو سکتا ہے، صرف عزم صادق کی ضرورت ہے، اور لڑائی کے میدان میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔

بہادر شاہ۔ تمہارے پاس اب کتنی فوج ہے؟

بخت خاں۔ اتنی ہے کہ ہم انگریزوں سے اچھی طرح نپٹ لیں گے ظلِ سبحانی کو کسی طرح کی زحمت اور تکلیف نہیں ہونے پائے گی،!

بہادر شاہ۔ اب ہماری سرگرمیوں کا کون سا مقام ہوگا؟ مطلب یہ کہ ہمیں یہاں سے کہاں جانا پڑے گا؟

اپنی اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھی غور سے دیکھ رہی ہیں کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے
جس دن ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری ہو جائے گا، وہ سب ہماری امداد کے لیے
اُٹھ کھڑی ہوں گی۔

مرزا الٰہی بخش۔ یہ بھی غلط ــــــ خود صاحب عالم مرزا جواں بخت، راجستان کے
والیانِ ریاست کے پاس پہنچے، انہیں سبز باغ دکھایا، حکومت انہیں سونپ
سونپ دینے کی پیش کش کی، مگر نتیجہ کیا نکلا؟ ــــــ صاف انکار!

بخت خاں۔ ہر ریاست کا دل انگریزوں سے پک گیا ہے، جھانسی، پونہ،
اور ناگپور کی ریاستوں کا حال سب کے سامنے ہے کہ انگریزوں کے کیسے
عجیب مگر خلافِ انصاف حیلوں اور بہانوں سے ان ریاستوں کو ضبط کر لیا
ایسی حالت میں اگر محفوظ مقام پر بیٹھ کر جہاں پناہ انگریزوں کا مقابلہ کریں
گے تو تمام ملک ہمارا ساتھ دے گا، آدمی، رسد، روپیہ اور ہتھیار لڑائی میں
انہی چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ہمیں حاصل ہیں!

مرزا الٰہی بخش۔ پھر جیتے کیوں نہیں ہار کیوں گئے؟

بخت خاں۔ آپس کے نفاق سے، باہمی جنگ سے، مرزا مغل کی خود رائی سے
آپ کی ذرا اندازی سے!

بہادر خاں۔ سچ کہتے ہو بخت خاں۔

بخت خاں۔ اگر انگریز اپنے ملک کا بچہ بچہ ہم پر چڑھا لائیں، تب بھی ہم صدیوں
تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور آج تو ان کے مددگار ہمارے ملکی بھائی
ہیں جنہیں بہکا سکھا کر، انعام اور لوٹ کے مال کا وعدہ کر کے وہ سمیٹ
لائے ہیں، جب ہمارے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ
اسی قسم کے وعدے کر سکیں گے۔

کی سلطنت کے تلوار کی نوک سے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے نفے میں جانتا ہوں تم پٹھان ہو، اور پٹھان سینکڑوں برس تک کینہ کو نہیں بھولتے لیکن تم اپنے مقصد میں جب تک الٰہی بخش زندہ ہے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بخت خاں۔ (تلوار میان سے نکال کر، خاموش)

مرزا الٰہی بخش، بخت خاں کی تلوار دیکھ کر سہم گئے

بہادر شاہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

بہادر شاہ۔ بخت خاں اگر تم کسی کی جان لینا چاہتے ہو، تو میری گردن کاٹ لو لیکن میں اپنے سامنے یہ کشت و خون نہیں دیکھ سکتا۔

بخت خاں۔ جہاں پناہ، کیا غلام کی جاں نثاری کا یہی صلہ ہے؟

بہادر شاہ۔ بہادر — مجھے تیری مہربانی کا یقین ہے، اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں، مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے، میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو، بسم اللہ کرو، جاؤ کچھ کام کر کے دکھاؤ، میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں، نہ سہی، تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے، مسلمانوں کا وقار پھر سے قائم کر دے، ہمارا فکر نہ کرو، اپنا فرض انجام دو!"

بخت خاں اس جواب سے مایوس ہو گیا، اور ہونٹ چباتا ہوا، مقبرہ کے مشرقی دروازہ سے دریا کی طرف اُتر گیا، اور فوج کو ساتھ لے کر ایسی جگہ غائب ہوا جہاں آج تک کوئی نہ سکا[1]، وہ ایسا عاقل آدمی تھا اور اس کی فوج

---

[1] یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، واقعی پھر بخت خاں اور اس کی فوج کا انگریزوں کو تلاش بسیار کے باوجود پتہ نہیں چلا۔

مرزا الٰہی بخش۔ کیا جہاں پناہ تشریف لے جائیں گے؟

بہادر شاہ۔ کیوں کیا ہوا؟ تم چاہتے ہو ہم اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ ہمیں ذلیل کریں۔

مرزا الٰہی بخش۔ ایسا نہیں ہو سکتا جہاں پناہ، بھاگنے کی ضرورت لارڈ گورنر بخت خاں کو ہے، انگریز جن کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، آپ کو تو وہ معصوم سمجھتے ہیں، انہیں یقین ہے، یہ جو کچھ ہوا اس کے کرانے والے دوسرے ہی لوگ تھے، جہاں پناہ نہ تھے۔ اور آپ چلے گئے تو بے شک ان کی رائے بدل جائے گی!

بہادر شاہ۔ تم چاہتے ہو ہم نہ جائیں؟

مرزا الٰہی بخش۔ غلام یہی چاہتا ہے ——— وہ انگریزوں سے وعدہ لے چکا ہے کہ جہاں پناہ کو، شاہی خاندان کو کسی طرح ہدفِ ستم نہیں بنایا جائے گا، ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی فرق نہیں آئے گا، ان کا وظیفہ بدستور جاری رہے گا، ان کی پوزیشن بالکل وہی رہے گی، جو پہلے تھی!

بخت خاں۔ آج تصدیق ہو گئی کہ تم انگریزوں کے جاسوس ہو!

مرزا الٰہی بخش۔ اگر جاسوس بھی ہوں تو اس لئے کہ اپنے آقا اور مالک کو مصیبتوں اور ذلتوں سے بچاؤں، تم ابھی کہہ چکے ہو کہ جہاں پناہ کو اس تکلیف سے محفوظ رکھو گے!

بخت خاں۔ بے شک یہ میں نے کہا تھا، اور اپنے قول پر قائم ہوں۔

مرزا الٰہی بخش۔ ظلِّ سبحانی کو اس سخت موسم میں، اس بڑھاپے، ضعف اور بیماری کی حالت میں تم صرف اس لئے لے جانا چاہتے ہو کہ ہندوستان کی بادشاہت تم کو مل جائے، اور صدیوں کا انتقام مغلوں سے لیا جائے، جنہوں نے پٹھانوں

چراغ بجھ گیا ناروں میں روشنی نہ رہی

میجر ہڈسن کو، مرزا الٰہی بخش نے تمام حالات کی اطلاع دے دی، اپنے نامہ میں انہوں نے لکھا کہ :-

"باغی فوج بادشاہ کو ساتھ لے جانے میں کامیاب
نہیں ہوئی، اب بادشاہ کا مقبرہ میں کوئی مخدوش
حمائتی باقی نہیں رہا ہے، آپ اطمینان سے
تشریف لائیے!"

ہڈسن نے یہ خط جنرل کو دکھایا، اور بادشاہ کو گرفتار کرنے کی اجازت طلب کی۔

جنرل ولسن۔ بادشاہ کو گرفتار کر لاؤ، تمہیں اس کی اجازت دی جاتی ہے۔
میجر ہڈسن۔ لیکن وہ نہیں، اس کی لاش آئے گی یہاں،!
جنرل ولسن۔ جلد بازی سے کام نہ لو، ابھی صرف دلی قبضہ میں آئی ہے، باقی تمام ہندوستان بغاوت کی آگ سے گرم ہو رہا ہے، لہٰذا مصلحت یہ ہے، کہ فی الحال بادشاہ کو زندہ رکھا جائے۔

اس گفتگو کے بعد ہڈسن[1] اپنے سواروں کو لے کر مقبرہ ہمایوں کے مغربی دروازے

---

[1] ہڈسن صاحب بہت سنگ دل اور سخت آدمی تھے، ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے۔
بقیہ صفحہ ۲۳۴ پر

ایسی اطاعت گذار بھی اس ساری مدّت غدر میں بھی اس کا یا اس کی فوج کا ذرا بھی نقصان نہیں ہوا۔ دہلی نے چند مہینے تک جو مقابلہ کیا، وہ اسی کے حسنِ تدبیر کا نتیجہ تھا۔ ورنہ باہر آئی ہوئی باغی فوجیں ایسی ابتری کی حالت میں تھی کہ دو دن بھی مقابلہ نہ کر سکتیں[1]۔

---

[1]۔ دلّی کی جان کنی۔

منشی رجب علی بھی۔

ہڈسن نے پیام بھیجا،

"میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں!"

یہ سنکر مرزا مغل اور دوسرے شہزادوں کی تیوریاں چڑھ گئیں، انہوں نے کہا،۔

"تیموری خاندان کے لوگ مرنے سے پہلے گرفتار نہیں ہوتے!"

لیکن مرزا الٰہی بخش نے پھر نصیحت کا دفتر کھول دیا، اور ایسے اتار چڑھاؤ دکھائے ایسی امیدیں دلائیں، اور وعدے کئے کہ وہ لڑنے کے خیال سے دستبردار ہو گئے، اور مرزا الٰہی بخش کے ہمدردانہ مشورہ کے مطابق، تن بہ تقدیر ہڈسن کے پاس جانا قبول کرلیا۔

ہڈسن نے غضبناک نظروں سے شہزادوں کو دیکھا، مگر خاموش کھڑا رہا، اور رتھوں میں سوار ہو جانے کا حکم دیا، شہزادے سوار ہو گئے تو ہڈسن ان کو محاصرہ میں لے کر دِلّی کی طرف روانہ ہوا، جب دِلّی ایک میل رہ گئی، تو رتھوں کو ٹھہرایا، اور شہزادوں کو حکم دیا کہ باہر آجائیں، وہ باہر اُتر آئے، تو حکم دیا کہ شاہزادگی کا لباس اُتار ڈالیں، شہزادے ایک دوسرے کو حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگے،

آخر وہ رتھوں سے اُترے، انہوں نے لباس شاہزادگی بھی اُتار دیا، جو عام لباس کے اُوپر پہنا جاتا تھا، اور ہڈسن کو دیکھنے لگے کہ اب کیا کہتا ہے؟ ہڈسن اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے ایک سوار سے بھری ہوئی قرابین مانگی، اور اس ہاتھ میں لے کر تڑا تڑ تین فیر کئے، گولیاں شہزادوں کے سینے میں لگیں اور اور وہ "ہائے دھوکہ" کہہ کر زمین پر گر پڑے، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ——— مر گئے۔

ہڈسن ان کے تڑپنے اور خاک و خون میں لوٹنے کو کھڑا دیکھتا رہا، اس کا

پر آیا، اور وہیں باہر کھڑا رہا، اور اندر بادشاہ کو اطلاع بھیجی کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔

ہڈسن کا یہ پیغام جب بادشاہ کو پہنچا تو انہوں نے گھور کر مرزا الٰہی بخش کو دیکھا اور کہا:۔

"کیا اب بھی تمہیں اپنے غدّار نہ ہونے پر اصرار ہے؟"

مرزا الٰہی بخش سر جھکائے خاموش کھڑے رہے، ہڈسن نے بادشاہ کو ایک پالکی میں (زینت محل، اور جواں بخت سمیت) بٹھایا، اور ناظر حسین مرزا کے مکان میں لا کر قید کر دیا۔

مرزا الٰہی بخش کا کارنامہ ابھی ختم نہیں ہوا۔

" بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن، مرزا الٰہی بخش نے خبر دی کہ مرزا مغل اور دوسرے شہزادے بھی ہمایوں میں موجود ہیں، میجر ہڈسن کا خون اس خبر سے جوش میں آگیا، وہ جنرل ولسن سے اجازت لے کر شہزادوں کے قتل کے لئے روانہ ہوا مسٹر میکڈانلڈ بھی ہڈسن کے ہمراہ تھے، اور دونوں جاسوس مرزا الٰہی بخش اور

(صـ ۲۳۳ کا بقیہ) کہ میدان جنگ ان کا اپنا گھر تھا، جنگی نفری کے سوا ان کو موسیقی اور نغمہ کا شوق نہ تھا۔ انسان کی کوئی مصیبت ان کے دل پر اثر نہ کرتی تھی، وہ آدمی کے مار ڈالنے کو تنکے کے توڑ ڈالنے سے کچھ زیادہ نہ سمجھتے تھے، بھاگتے اور پناہ مانگتے ہوئے آدمیوں کو قتل کرنا ان کی مسرت و شادمانی کا کام تھا، غدر ۱۸۵۷ء کے وقت دہلی شہر میں جو مظالم ان کے ہاتھ سے ہوئے وہ ان کی ذاتی خصلت کا نمونہ تھے، برٹش خصائل کو ان سے تعلق نہ تھا!"

سلہ۔ مرزا الٰہی بخش کے اس کارنامہ کی انگریزوں نے یوں داد دی کہ بھارت سے ان کے رخصت ہونے کے وقت تک، ان کی اولاد کو، بارہ سو روپے ماہوار پنشن ملتی رہی۔ "بہ غدر"

تھا، اور آج وہ نانِ شبینہ کی محتاج ہے، ایک غریب سپاہی نے اسے اپنی لڑکی بنا کر پناہ دی ہے، جہاں رُوکھا سوکھا کھانے کو ملتا ہے، اور موٹا جھوٹا کپڑا پہننے کو، اور واقعی اس کا افسانۂ الم دل کے ٹکڑے کر دینے کو کافی ہے:-

"جب غدر ہوا ہے تو ہم دو بہن بھائی اور ایک ابا حضرت اور ایک اماں حضرت موجود تھے۔ بادشاہ سلامت قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے اور بھی بہت سے قلعے کے رہنے والے باہر نکل گئے اور قلعہ خالی ہو گیا۔ مگر ہمارا مکان قلعے کی عمارتوں سے ذرا الگ تھا، اور بہت مضبوط تھا، اس لئے ابا حضرت راضی نہیں ہوئے، انہوں نے کہا باہر جائیں گے تو وہاں بھی مریں گے اور باہر کا مرنا بڑی بے غیرتی کا مرنا ہوگا، اس واسطے یہیں گھر میں رہو جو خدا کو منظور ہوگا اسی گھر میں ہو جائے گا۔

بادشاہ سلامت کے جانے کے بعد دو دن تک ہمارے گھر میں کوئی نہیں آیا باہر کے نوکر اور گھر کی مامائیں سب بھاگ گئے تھے ہم نے گھر کے دروازے بند کر لئے تھے ڈیوڑھی میں تین چار دروازے تھے اور موٹی موٹی کنڈیاں بھاری بھاری کواڑ اُن میں لگے ہوئے تھے تیسرے دن مکان کے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں اور بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں اور کسی نے دروازے توڑنے شروع کئے میرے بھائی کی عمر سولہ برس کی تھی۔ ابا حضرت اور اماں حضرت نے فوراً وضو کیا اور بھائی سے کہا میاں اُٹھو تم بھی وضو کر لو مرنے کا وقت آگیا، یہ بات سُنکر میرا دل ہل۔ اور میں اماں حضرت سے جا کر لپٹ گئی۔ وہ رونے لگی اور مجھے پیار کیا اور کہا گھبراؤ نہیں اللہ مددگار ہے شاید وہ کوئی صورت جان بچنے کی نکال دے اس کے بعد سب نے وضو کیا اور فوراً ہم سب نے مصلّے بچھا کر اور سجدے میں سر جھکا کر اللہ میاں سے دعائیں مانگنی شروع کیں دروازے توڑنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں ہم سب سجدے ہی میں تھے کہ دس بارہ گورے اور دس بارہ سکھ بندوقیں لئے ہوئے جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں گھر کے اندر

چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، پھر ان کی لاشوں کو لے کر کوتوالی آیا، اور انہیں ایک رات دن سر بازار لٹکائے رکھا[1]۔

شہزادوں کے قتل کے بعد، ان کے سر کاٹے گئے، اور سروں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا، ہڈسن نے کہا۔

"یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی، اور جسے جاری کرانے کے لئے آپ نے غدر برپا کیا تھا۔!"

بہادر شاہ نے جوان بیٹوں، اور پوتوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے، تو حیرت انگیز استقلال سے، انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا اور کہا۔

الحمد للہ، تیمور کی اولاد ایسی ہی سُرخ رُو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی[2]

اور ——— عین اس وقت جب دلّی کے خونی دروازے پر مرزا مغل اور دوسرے شہزادوں کے سر لٹکائے جا رہے تھے، شاہ عالم کی ایک نوعمر پوتی ایک رحمدل مسلمان سپاہی کے گھر میں بیٹھی بڑے بھولے انداز میں اپنی جگر والوں کی داستان سُنا رہی تھی، اس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برس رہا تھا، یہ وہی لڑکی تھی جسے دنیا کا ہر عیش میسر

---

[1] تاریخ ہند (منشی ذکاء اللہ)

[2] لاشیں کوتوالی کے سامنے، اور سر موجودہ دلّی جیل کے سامنے خونی دروازے پر لٹکائے گئے، یہ وہی دروازہ ہے جس پر دارا شکوہ کا سر بھی لٹکایا گیا تھا، اور عبدالرحیم خانخاناں کے لڑکوں کے سر بھی لٹکائے گئے تھے، اسی لئے دلّی والوں نے اس کا نام خونی دروازہ رکھ دیا اس دروازہ کی دیوار سنگ خارا کی ہے، اور خارا میں لوہے کا اثر ہوتا ہے جو برسات میں اپنا سرخ رنگ بہایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس دیوار پر اب تک سُرخ دھبے نظر آتے ہیں، جن کے بارے میں عوام کا خیال ہے کہ خون کے اس نشان کو خدا نے قیامت کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔

میں اُٹھا لیا اور ابّا حضرت نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا ہم نے اپنے بھرے پڑے گھر کو حسرت کے ساتھ ایک نظر اُٹھا کر دیکھا کہ پھر ہم کبھی یہاں نہیں آئیں گے اور ایسا ہی ہوا کہ ہم پھر کبھی وہاں نہیں گئے۔

جب ہم گھر سے باہر نکلے تو وہ انگریز اور سکھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دو سکھ سواروں کو ہمارے ساتھ پہاڑی کی طرف بھیج دیا اور وہ خود کسی اور طرف گھوڑے دوڑا کر چلے گئے۔

قلعے کے دروازے تک تو وہ سکھ سوار آہستہ آہستہ چلتے رہے اور انہوں نے ابّا حضرت اور امّاں حضرت سے کچھ نہ کہا کیونکہ امّاں حضرت سے چلا نہ جاتا تھا اور وہ ہر دس قدم کے بعد بیٹھ جاتی تھیں اور رعشے سے اُن کا بدن کانپ رہا تھا، جب اماحضرت بیٹھ جاتیں تو وہ سکھ سوار بھی ٹھہر جاتے لیکن جب قلعے کے دروازے کے باہر پہنچے تو اُن سواروں نے سخت کلامی شروع کی اور کہا اس طرح تو شام ہو جائے گی، تم جلدی جلدی کیوں نہیں چلتے؟ والد نے نرمی سے جواب دیا بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ ایک بیمار اور کمزور عورت ہے جو ساری عمر کبھی پیدل نہیں چلی ہم شرارت اور سرکشی سے ایسا نہیں کرتے، عورت اور بچی کی وجہ سے مجبور ہیں سوار یہ سُن کر خاموش ہو گئے مگر میرے بھائی کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکلی کہ تم ہمارے مُلک کے ہو تم کو رحم نہیں آتا، اس پر ایک سکھ نے کہا ہم کیا کریں، حاکم کا حکم ہے بھائی نے کہا کہ حاکم نے یہ نہیں کہا کہ ہم پر ایسی سختی کرنا، سکھ سوار نے جواب دیا کہ ہم نے کونسی سختی کی لیکن اب سختی کرنی پڑے گی تم لوگ جان کر چلنے میں دیر لگاتے ہو۔ یہ کہہ کر ایک سوار ہمارے پیچھے آ گیا اور ایک آگے ہو گیا، اماں حضرت گھوڑے کو پیچھے دیکھ کر گھبرا گئیں ان کو اختلاج کا مرض تھا یکایک اختلاج کا دَورہ شروع ہو گیا اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑیں اور اُن کے مُنہ

آ گئے ابّا حضرت اور بھائی سجدے سے فوراً کھڑے ہو گئے امّاں حضرت نے مجھ کو گود میں
لے کر چادر سے مُنہ چھپا لیا ایک سکھ نے ابّا حضرت سے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیوں
بیٹھے ہو، ابّا حضرت نے جواب دیا یہ میرا گھر ہے اور میں اسی میں رہتا ہوں شاہ عالم
بادشاہ کی اولاد میں ہوں اس سکھ نے انگریز افسر کو یہ بات سمجھائی، انگریز افسر
نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کچھ کہا جس کو میں نہیں سمجھی تو پھر اس سکھ نے ابّا حضرت کو
سمجھایا کہ صاحب کہتے ہیں بادشاہ بھاگ گئے اور سب لوگ بھاگ گئے تم کیوں نہیں
بھاگے، ابّا حضرت نے کہا بادشاہ ہم سے کچھ ناراض تھے اس واسطے نہ وہ ہمیں ساتھ
لے گئے نہ ہم ان کے ساتھ گئے اور ہم نے سپاہیوں کے بلوے میں بھی حصّہ نہیں
لیا اور ہمیں یقین تھا کہ انگریز سرکار بے گناہ آدمیوں کو نہیں ستاتی، ہم بے گناہ تھے
اس واسطے ہم نہیں بھاگے انگریز افسر نے کہا تمہیں پہاڑی پر چلنا ہوگا ہم تحقیقات
کریں گے اگر تم بے گناہ ہوئے تو تم کو جان کی امان ملے گی۔ ابّا حضرت نے کہا میرے
ساتھ میری بیوی ہے اور ایک چھوٹی بچّی ہے اور یہاں کوئی سواری نہیں ہے اور ان
کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ہے انگریز افسر نے جواب دیا اس لڑائی کے وقت ہم
تمہارے لئے سواری کا انتظام نہیں کر سکتے اگر تم یہاں ٹھہرے رہو گے تو ڈر ہے کہ
دوسرے سپاہی یہاں آئیں گے اور بے خبری میں تم مار ڈالیں گے اس لئے تم کو
جلدی یہاں سے روانہ ہو جانا ضروری ہے ہم دو سپاہی تمہارے ساتھ کریں گے،
اگر راستے میں کوئی سواری مل جائے گی تو تمہاری عورت اور تمہاری لڑکی اس میں بیٹھ جائے
گی نہیں تو ان سب کو پیدل چلنا ہوگا۔

مجبوراً ابّا حضرت تیار ہوئے اور انہوں نے کچھ قیمتی زیورات اور جواہرات اپنے
ساتھ لے کر باقی سارا سامان گھر میں چھوڑ دیا۔ اور فوج والوں کے ساتھ گھر کے باہر
نکلے امّاں حضرت ہمیشہ بیمار رہتی تھیں اور بہت کمزور تھیں مجھ کو بھائی نے گود

گئے۔ تو یہ اور ان کا لڑکا دونوں بہت کوشش کر رہے تھے اور اُن لوگوں سے حجّت بازی کرتے تھے۔ جو انگریز بچّوں اور عورتوں کے قتل کے خلاف رائے دے رہے تھے کہ یہ بات اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس وقت ان دونوں نے یہ کہا کہ سانپ کو مارنا اور اس کے بچّوں اور چھوڑ دینا عقلمندوں کا کام نہیں، اور محض انہی دونوں کے کہنے سے ان بچّوں اور عورتوں کو قتل کیا گیا۔ یہ سُن کر جرنیل غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اور اس نے پھر ابّا حضرت کی کوئی بات نہ سُنی، حالانکہ وہ برابر کہتے رہے کہ یہ بالکل جھُوٹ ہے۔ مگر جرنیل کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ اس نے کوئی بات نہ سُنی اور حکم دیا کہ ابھی ان دونوں کو گولی سے اُڑا دو اور پھر یہ کہا۔ کہ اگرچہ ان دونوں نے ہماری عورتوں اور بچّوں کو قتل کرایا۔ مگر ہم ان پر رحم کرتے ہیں، اور اس کی عورت اور بچّی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ان دونوں کو چھاؤنی سے نکال دو یہ جہاں چاہیں چلی جائیں، سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے بھائی اور ابّا حضرت کے ہاتھ پکڑ کر کر کے پیچھے باندھے، ابّا حضرت مجھ کو دیکھ کر رونے لگے مگر بھائی چپکے کھڑے رہے، امّاں حضرت نے ایک چیخ ماری اور وہ بیہوش ہو کر پڑیں، میں دوڑی کہ ابّا حضرت کو چمٹ جاؤں، مگر ایک سپاہی نے مجھ کو زور سے دھکا دیا۔ اور میں امّاں حضرت کے اُوپر گر پڑی، اور میں نے دیکھا کہ ابّا حضرت اور بھائی کو سپاہی کھینچتے ہوئے دُور لے گئے۔ اور ان کے سامنے پانچ چھ سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے ہوئے۔ اور ان کے پاس جرنیل بھی کھڑا ہو گیا، اور اس نے کچھ زور زور سے باتیں کیں جن کو میں سمجھ نہیں سکی، اس کے بعد سپاہیوں کو اشارہ کیا اور سپاہیوں نے بندوقیں اپنی چھاتی پر رکھیں اور بندوقوں کا مُنہ ابّا حضرت اور بھائی کی طرف کیا، اس وقت ابّا حضرت کی آواز آئی اور انہوں نے میرا نام لے کر پکارا اور کہا لو بیٹی اللہ بیلی ہم دُنیا سے جاتے ہیں۔ اور بھائی کی آواز

سے بے اختیار ہائے ہائے نکلنی شروع ہوئی، سکھ سوار یہ حالت چُپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کچھ دیر کے بعد اُس نے ابّا حضرت سے کہا میں پیدل چلتا ہوں تم اس بیار عورت کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاؤ آخر ابّا حضرت نے اماں حضرت کو گود میں اُٹھالیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلے اور وہ بے چارہ سکھ پہاڑی تک پیدل گیا اور میں بھائی کی گود ہی میں پہاڑی تک پہنچی۔

پہاڑی پر انگریزوں کی فوج چاروں طرف ٹھہری ہوئی تھی، ہم کو بھی ایک طرف خیمے میں ٹھہرا دیا گیا اور ان سکھ سواروں نے فوجی لانگری سے روٹی لا کر دی اور وہ رات ہم نے اسی خیمے میں گذاری، دوسرے دن فوج کے جرنیل نے ہم سب کو اپنے سامنے بلایا۔ دلّی کا کوئی مخبر اس انگریز کے پاس کھڑا تھا۔ اس سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو۔ اس مخبر نے کہا ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ بادشاہ کے خاندان سے ہیں۔ اور جب لال قلعے کے اندر انگریز مردوں، عورتوں اور بچّوں کو قتل کیا گیا۔ تو اس شخص نے ان کو قتل کرانے میں بڑا حصّہ لیا تھا۔ یہ سُنکر جرنیل نے ابّا حضرت کی طرف بہت غصّے کی نظر سے دیکھا۔ ابّا حضرت نے جواب دیا کہ یہ شخص جھوٹ کہتا ہے یہ پہلے میرے ہاں نوکر تھا، اور چوری کے الزام میں مَیں نے اس کو ایک دفعہ بہت پٹوایا تھا، اور نوکری سے موقوف کر دیا تھا، اس واسطے دشمنی سے ایسا کہتا ہے آپ اس سے اتنا پوچھئے کہ بہادر شاہ بادشاہ کتنے سال سے مجھ سے ناراض تھے اور میرا سلام کتنے عرصے سے بند تھا؟ مخبر نے جواب دیا یہ ٹھیک ہے۔ کہ میں ان کے ہاں نوکر تھا، مگر یہ غلط ہے کہ مجھے چوری کے الزام میں انہوں نے پٹوایا تھا میں نے خود ان کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ یہ تنخواہ کم دیتے تھے، اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ ان سے ناراض تھے لیکن جب غدر ہوا تو انہوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے ان کے پاس جانا آنا شروع کیا۔ اور جس دن انگریز قتل کئے

گروہ بکریوں کی طرح ہم کو کھینچے لئے جا رہے تھے، پہاڑی کے پتھروں سے ہمارے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے، اور میں نہیں کہہ سکتی کہ دنیا میں جیسی تکلیف اس وقت ہمیں تھی ایسی تکلیف اور بھی کسی کو پیش آسکتی ہے۔

فوجی چھاؤنی سے باہر لاکر سپاہیوں نے ہم کو چھوڑ دیا، اماں بالکل بیہوش پڑی تھیں اور میں ان کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، تھوڑی دیر میں ایک گھسارہ گھاس کی گٹھڑی لئے ہوئے ادھر سے گزرا، اور میرے پاس آیا، اس نے گٹھڑی سر سے اتار کر اماں کو دیکھا اور یہ کہا عورت تو مر گئی، وہ ہندو تھا، مجھ کو وہاں چھوڑ کر چھاؤنی گیا۔ اور دو تین مسلمان گھسیاروں کو لایا، ان سب نے کہا، یہ عورت مر گئی انہوں نے میرے اور میری اماں کے زیور اتار لئے، پھر انہوں نے گڑھا کھود کر اماں کو دبایا، اور دو آدمی مجھ کو اٹھا کر اجمیری دروازے کی طرف لائے اور یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔[1]

---

[1] بیگمات کے آنسو۔

آئی۔ امّاں۔ امّاں مجھ سے تمہاری تنہائی دیکھی نہیں جاتی، سلام میں مرتا ہوں، بندوقوں
کی آواز آئی، اور بہت سا دھواں نکلا میں نے دیکھا بھائی اور ابّا خاک میں لوٹ
رہے ہیں۔ میں رو رہی تھی، اور میرا دل ڈر کے مارے بیٹھا جاتا تھا امّاں کو ذرا ہوش
آیا میں نے ان سے کہا، بھائی کو اور ابّا کو مار ڈالا۔ دیکھو وہ خاک میں تڑپ رہے
ہیں، ارے ہے، امّاں جان ان کے سینے سے خون اُبل رہا ہے۔ میرے بھائی اور
ابّا مجھ سے بچھڑ گئے اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملیں گے۔ ابّا نے تو مجھے پکارا بھی
تھا۔ اور بھائی نے تم کو پکا تھا، اچھی، امّاں اب کیا ہو گا۔ یہ ہم کو بھی مار ڈالیں
گے۔ کیا یہ ہم کو قیدی بنالیں گے امّاں دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر سہارے
سے اُٹھیں، اور انہوں نے بھائی کی اور ابّا حضرت کی لاشوں کو غور سے دیکھا
ان کا تڑپنا بند ہو گیا تھا، اور بے تاب ہو کر کہا میرا بیٹا۔ میرا لال، میری سولہ
برس کی محنت!!! میری زندگی کا آخری سہارا، میرا دُولہا مجھ سے چھن گیا، میں مٹ
گئی۔ میرا اس دُنیا میں کچھ نہیں رہا۔ میں دُنیا میں آئی تھی، یا اللہ یہ خواب ہے، یا سچ مچ
مجھ پر مصیبت آئی ہے، میرا سہاگ ہی خاک میں مل گیا۔ وہ جوان بیٹے کے پاس، جو
خون میں نہایا ہوا پڑا ہے۔ اے مخبر خدا تجھ کو غارت کرے تو نے بالکل جھوٹ بولا یہ
دونوں تو غدر کی شروعات سے آخر تک گھر سے بھی نہیں نکلے، ارے تُو نے کس
دن کا بدلہ لیا۔ مجھ بیچاری دُکھیا پر بھی تجھ کو رحم نہ آیا، تو نے اس معصوم بچی کا خیال
نہ کیا اور ہمارے وارثوں کو بے خطا اور بے قصور خون میں ڈبو دیا، امّاں یہ کہہ
رہی تھیں کہ دیسی فوج کے سپاہی آئے اور مجھ کو اور امّاں کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور
کھینچتے ہوئے چلے ہم دونوں لاشوں کے پاس سے گزریں گولیاں سینوں پہ
اور چہروں پر لگی تھیں خُون نے سب کو چھُپا دیا تھا اور لاشیں چپ چاپ پڑی تھیں
سپاہی ہم کو کشاں کشاں لئے جا رہے تھے، نہ امّاں چل سکتی تھیں، نہ میں چل سکتی تھی،

گول اور تکئے ہوتے تھے جن کو گال دگل تکیہ کہا جاتا ہے۔ یہ تکئے رخسار کی ٹیک کے لئے تھے کہ اگر شہزادی کا سر تکیوں سے نیچے آجائے۔ تو گل تکئے ان کے رخسار کو تکلیف سے بچالیں، دو تکئے ذرا بڑے بڑے دونوں پہلوؤں میں ہوتے تھے، کہ ان سے شہزادی صاحبہ اپنے گھٹنے کو سہارا دے سکیں، رات کو جب نرگس نظر مسہری کے اندر جاتی تھیں تو مولسری اور جوہی اور چمپا کے پھول ان کے گل تکیوں کے پاس رکھے جاتے تھے، رات کو ان کی خوشبو شہزادی کو مسرور کرتی رہے، جوں ہی نرگس نظر مسہری میں گئیں چار ناچنے والی چھوکریاں آجاتیں تھیں، اور مل کے سُروں میں گاتی تھیں، تب جاکر شہزادی کو نیند آتی تھی، صبح کو بھی سُورج نکلنے سے پہلے یہ ناچنے گانے والی لڑکیاں مسہری کے قریب آکر گاتی تھیں، اور ان کی سُریلی آوازوں کو سُن کر شہزادی صاحبہ بیدار ہوتی تھیں۔

شہزادی بیدار ہونے کے بعد مسہری کے اندر بیٹھ جاتیں اور دیر تک جمائیاں لیتیں، انگڑائیاں لیتیں، اور گانے والی لڑکیاں ان سے ہنسی کی باتیں کرتیں۔

نرگس نظر مسکراتی ہوئی مسہری کے باہر آتیں طشت چوکی پر جاتیں پھر باہر آکر کھلی اور بیسن سے منہ ہاتھ دھوتیں، پھر جوڑا بدلا جاتا، ناشتہ کیا جاتا، اس کے بعد گھر کی آرائش کو خود جاکر دیکھتیں، اور نئی نئی ایجادیں چیزوں کے سنوارنے میں ہوتیں، دوپہر کا کھانا کھاکر گانا ہوتا، شام کو چمن میں گلگشت کا معمول پورا کیا جاتا، رات کے کھانے میں بڑی بہار ہوتی، باجے بج رہے ہیں۔ گانے ہو رہے ہیں، اور سہیلیوں کے ساتھ کھانا کھایا جارہا ہے۔

جس رات بہادر شاہ بادشاہ لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گئے اور یقین ہوگیا، کہ صبح انگریز دہلی کو فتح کرلیں گے، نرگس نظر چپ چاپ جل محل کے کنارے کھڑے چاندنی دیکھ رہی تھیں ان کا عکس تالاب میں پڑ رہا تھا، اور ان پر

لال قلعہ میں دیوانِ خاص اور موتی مسجد کے غرب میں، اور گورا ہیر کس کے شرق میں، ایک سنگین تالاب ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت اور نظر فریب محل بنا ہوا ہے، اس کے شمال سے نہر آئی ہے، سنگِ مرمر کی جھلملیاں اور چراغدان بنے ہوئے ہیں، ان پر سے نہر کا پانی گذرتا ہوا اس تالاب میں آتا تھا، میرزا شاہ رُخ، بہادر (بہادر شاہ کے بیٹے) اسی جل محل میں رہتے تھے، ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، میرزا صاحب کو اپنی بیٹی نرگس نظر سے بہت ہی محبت تھی۔

جل محل کو کشمیری شالوں اور رومی قالینوں اور بنارسی کپڑوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا، نرگس نظر کی طبیعت میں نفاست و نزاکت اور سلیقہ مندی بہت زیادہ تھی، ان محل سارے قلعے میں سب حویلیوں اور محلات سے زیادہ خوبصورت اور آراستہ سمجھا جاتا تھا، شہزادی نرگس نظر کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح سورج نکلنے کے بعد بیدار ہوتی تھیں، گرمی کے موسم میں ان کا چھپر کھٹ صحن میں بچھایا جاتا تھا جہاں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ چھپر کھٹ کے پائے اور ڈنڈے سونے کے تھے اور ان پر نگینے جڑے ہوئے تھے۔ خوبصورت ریشمی کپڑے کی مسہری تھی، اندر ریشمی تکیے رکھے رہتے تھے، چار نازک نازک نرم نرم تکیے سرہانے ہوتے تھے، اور سرہانوں کے تکیوں کے پاس دو چھوٹے چھوٹے گول

ہیں۔ نرگس نظر نے بہت دیر باپ کی راہ دیکھی مگر وہ نہ آئے اور نرگس نظر گھبرا کر رونے لگیں، رات کے دو بجے ایک خواجہ سرا محل میں آیا، اور اس نے کہا صاحب عالم نے فرمایا ہے کہ انگریزی جاسوس میری تلاش میں قلعے کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، میں تمہارے ساتھ غازی نگر نہیں جا سکتا، سواری کا انتظام کر دیا ہے تم خواجہ سرا کے ساتھ چلی جاؤ اور میں بھیس بدل کر کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ نرگس نظر، نے گھبرا کہا۔ آخر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ خواجہ سرا بولا۔ مجھے معلوم نہیں، نرگس نظر نے حاکمانہ لہجہ میں کہا، جا ابھی معلوم کر کے آ کہ ابا حضرت کہاں جانے والے ہیں۔ وہ لباس بدل کر میرے ساتھ غازی نگر کیوں نہیں چلتے۔ ؟

خواجہ سرا فوراً واپس گیا۔ اور نرگس نظر صحن میں ٹہلتی رہی کچھ دیر کے بعد خواجہ سرا واپس آیا۔ اور اس نے کہا، ابا حضرت سائیس کے کپڑے پہن کر قلعے کے باہر چلے گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ کہاں چلے گئے، اور آپ کی سواری کے لئے رتھ تیار ہے نرگس نظر کو رونا آ گیا۔ رونے کا ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، انہوں نے جواہرات اور دیورات کا صندوقچہ اور چند ضروری کپڑے ساتھ لئے جن کو خواجہ سرا نے اٹھا لیا اور جل محل سے نکلیں اور سوار ہونے سے پہلے مڑ کر جل محل اور اس کی آرائش کو بہت دیر تک کھڑے ہو کر دیکھا، پھر کہا خبر نہیں تجھ کو پھر دیکھنا نصیب ہو گا یا آج تو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔

رات کے تین بج چکے تھے، نرگس نظر رتھ میں بیٹھی غازی نگر (غازی آباد) کی طرف جا رہی تھیں صبح آٹھ بجے غازی آباد پہنچ گئیں، راستے میں ان کو بہت لوگ آتے جاتے ملے مگر کسی نے ان کے رتھ کی مزاحمت نہیں کی، غازی آباد میں نرگس نظر کی انا کا گھر مشہور تھا، جونہی نرگس نظر انا کے گھر کے سامنے رتھ سے اتری، انا دوڑی ہوئی گھر کے باہر آ گئی۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے شہزادی کی بلائیں لیں،

اپنی دید کا ایک عجیب عالم محویت طاری تھا۔

یکایک ان کے باپ میرزا شاہ رخ اندر آئے اور انہوں نے کہا نرگس بیٹا میں ابا حضرت (بہادر شاہ) کے ہمراہ جانا چاہتا ہوں، تم ابھی چلو گی یا سواری کا بندوبست کر دوں صبح آجانا، نرگس نظر نے کہا، ابا جان آپ بھی ابھی نہ جائیے پچھلی رات میرے ساتھ چلیے گا میں دادا حضرت کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھتی، انگریزی فوج انہی کی تلاش کرے گی اور جو لوگ ان کے ساتھ ہونگے وہ سب مجرم سمجھے جائیں گے، اس لئے ہمایوں کے مقبرے میں دادا حضرت کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے، غازی نگر (غازی آباد) چلیے وہاں میری انا کا گھر ہے اور سُنا ہے بہت اچھی اور محفوظ جگہ ہے، گمنامی اختیار کر کے چلنا چاہیئے جب یہ بلا دور ہو جائے گی پھر یہاں آجائیں گے۔

میرزا نے کہا، اچھا جیسی تمہاری رائے ہو، غازی نگر جانے کے لئے رتھوں کا بندوبست کرتا ہوں تمہارے ساتھ کون کون جائے گا۔

نرگس نظر نے جواب دیا، کوئی نہیں صرف میں اکیلی چلوں گی، کیونکہ نوکروں کا ساتھ رکھنا بھی نامناسب ہے، اور نوکر ساتھ جانے کے لئے تیار بھی نہیں معلوم ہوتے میرزا یہ سُن کر باہر چلے گئے، اور نرگس نظر پھر ماہتاب اور عالم آب کو دیکھنے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد نرگس نظر نے نوکر عورتوں کو آواز دی مگر کسی نے جواب نہ دیا، معلوم ہوا سب بھاگ گئے، اور نرگس نظر سارے جل محل میں اکیلی ہوں، یہ پہلا موقع تھا کہ نرگس نظر نے حاکمانہ آواز دی اور جواب میں کوئی بھی نہ بولا، نرگس نظر گھبرا کر محل کے اندر گئیں شمعیں روشن تھیں مگر کوئی آدمی موجود نہ تھا، نرگس نظر کو اندر ڈر لگا، اور وہ پھر باہر صحن میں آگئیں قلعے میں جگہ جگہ سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے گھروں کے رہنے والے نکل نکل جا رہے

لی جائے گی۔ نوجوان سردار یہ سُن کر بگڑا اور اس نے آگے بڑھ کر نرگس نظر کے بال پکڑ لئے اور ان کو زور سے جھٹکا دیا۔ بوڑھے سکھ سردار نے نوجوان سردار کو روکا اور کہا عورت کے ساتھ ایسی زیادتی کرنی مناسب نہیں ہے۔ نوجوان سردار نے یہ بات سُن کر بال چھوڑ دیئے۔ پھر کرائے کی ایک بیل گاڑی منگوائی گئی اور اس میں نرگس نظر کو سوار کیا گیا۔ اَنا اور اس کے گھر والے بھی سب قید ہو کر پیدل ساتھ چلے۔ نرگس نظر سے پوچھا گیا۔ تمہارا زیور اور روپیہ پیسہ کہاں ہے انہوں نے کہا میں خود ہی زیور ہوں۔ اور خود ہی سمجھنے والوں کے لئے جواہر اور دولت ہوں۔ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔

یہ سُن کر دونوں سردار خاموش ہو گئے۔ اور پہلی کو دہلی کی طرف لے چلے ہنڈن ندی کے پاس گاؤں کے جاٹوں اور گوجروں نے سکھ فوج والوں پر بندوقیں چلائیں اور دیر تک ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہی، سکھ تھوڑے تھے، اور گاؤں والے زیادہ تھے سکھ سب مارے گئے۔ اور گاؤں والے قیدیوں کو اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔

گنواروں نے نرگس نظر کے جسم پر جو دو چار قیمتی زیور تھے ان کو اُتار لیا! اور قیمتی کپڑے بھی اُتر والئے اور کسی چماری کا پھٹا ہوا لہنگا اور پھٹا ہوا کُرتہ اور میلا دوپٹہ پہننے کو دے دیا! نرگس نظر نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا، اور مجبوراً تن ڈھکنے کو یہ کپڑے، گاؤں کے چند مسلمان گنوار آئے اور ان کے نمبردار نے نرگس نظر کو گوجروں سے خرید لیا۔ اور اپنے گاؤں میں لے گئے، یہ لوگ ذات کے رانگھڑ تھے، اور کچھ لوگ تگا قوم کے مسلمان تھے۔ نمبردار نے اپنے لڑکے کا پیغام دیا۔ کہ تیری شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ یہ بڈھا آدمی تھا، اور اس کا لڑکا اگرچہ گنوار تھا، لیکن صورت شکل کا اچھا تھا۔ گاؤں کے قاضی نے اُس کا نکاح پڑھا دیا[1]۔ نرگس نظر تین چار

---

[1] بیگمات کے آنسو

اور اندر لے کر بٹھایا۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ خاطر مدارت کی نرگس نظر دو تین روز انا کے گھر میں آرام سے رہیں یکایک خبر مشہور ہوئی کہ بادشاہ گرفتار ہو گئے اور کئی شہزادے قتل کر دیئے گئے۔ اور فوج غازی آباد کو لوٹتے آ رہی ہے، نرگس نظر نے جواہرات کا صندوقچہ انا سے کہہ کر زمین میں دفن کرا دیا۔ اور مصیبت کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں، تھوڑی دیر میں سکھ فوج غازی آباد میں داخل ہوئی اور اس نے باغیوں کی تلاش کرنی شروع کی۔ مخبروں نے کہا، بادشاہ کی پوتی اپنی انا کے گھر میں موجود ہے، دو سکھ سردار چار سپاہیوں کے ساتھ انا کے گھر میں آئے، اور انہوں نے انا کو اور سب گھر والوں کو پکڑ لیا۔ نرگس نظر کوٹھڑی میں چھپ گئی تھیں۔ ان کو بھی کواڑ توڑ کر باہر نکالا گیا۔ اور بے پرواسامنے کھڑا کیا گیا سردار نے پوچھا۔ کیا تم بہادر شاہ کی پوتی ہو۔ نرگس نظر نے کہا، میں ایک آدمی کی بیٹی ہوں، بادشاہ کی اولاد ہوتی۔ تو اس غریب گھر میں کیوں آتی، اگر خدا نے بادشاہ کی پوتی بنایا ہوتا۔ تو تم اس طرح بے پردہ مجھ کو سامنے کھڑا نہ کرتے، تم ہندوستانی ہو تم کو شرم نہیں آتی۔ کہ اپنے ملک کی عورتوں پر ظلم کرتے ہو۔ سردار نے کہا۔ تم نے کیا ظلم کیا ہم تو یہ دریافت کرتے ہیں۔ کہ تم کون ہو۔ ہم نے سنا ہے کہ تم بہادر شاہ کی پوتی ہو۔ اور تمہارے باپ نے بہت سے انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قلعے کے اندر قتل کیا تھا۔ نرگس نظر نے کہا۔ جو کرتا ہے وہی بھرتا ہے۔ اگر میرے باپ نے ایسا کیا ہو گا تو ان سے پوچھو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا، میں نے کسی کو نہیں مارا۔ یہ سُن کر دوسرا نوجوان سکھ سردار بولا، ہاں تم تو آنکھوں سے قتل کرتی ہو تم کو تلواروں سے اور ہتھیاروں سے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ نرگس نظر نے نہایت جرأت کے ساتھ جواب دیا حالانکہ اس زندگی میں غیر مردوں سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا، خاموش رہو۔ بادشاہوں سے ایسی بے تمیزی کے ساتھ بات نہیں کرتے۔ تمہاری زبان گُدّی کے پیچھے سے نکال

کلثوم زمانی

دِلّی کی بساطِ حکومت اُلٹ چکی ہے، مغلیہ خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ بہادر شاہ اسی لال قلعہ میں جہاں فرمانروا کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے تھے بغاوت کا مقدمہ چلا اور وہ وطن کرکے رنگون بھیجا دیاں گئے، وفادار بیوی زینت محل ساتھ تھی، اور بدنصیب لڑکا جواں بخت بھی۔

جواں بخت کی بدنصیبی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے؟ اس نے اس دنیا سے حسرت ناکام، اور آرزوئے خام کے سوا کیا پایا۔ جو کچھ اس نے چاہا وہ نہ ہُوا، وہ چاہتا تھا، مغلیہ سلطنت کا آفتاب پھر چمکنے لگے، لیکن وہ ایسا گھنایا کہ پھر اس مصیبت سے نہ نکل سکا، وہ چاہتا تھا، انگریز اس دیس سے نکال دیئے جائیں، لیکن اب وہ حاکم کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے، وہ کشور آرا کو دل و جان سے چاہتا تھا لیکن وہ بھی اسے دغا دے گئی۔

فرخ سلطان، کشور آرا اور چند دوسری شہزادیوں کے لئے جہاں پناہ کے حکم یہ صادر فرمایا تھا کہ فی الحال انہیں جھجر بھیجدیا جائے، جب حالات ذرا سازگار ہوں گے تو بلا لیا جائے گا، ایک رتھ پر یہ شہزادیاں بیٹھیں، چند خواجہ سرا ساتھ تھے، اور یہ قافلہ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہُوا، کچھ دُور جانے کے بعد انگریز فوج کا ایک دستہ ادھر سے گذرا، اس نے ان سب کو گھیر لیا، خواجہ سرا بھاگ کھڑے ہوئے فرخ سلطان

جھینے نمبردار کے گھر میں نئی دلہن بنی آرام سے بسراوقات کرتی رہیں۔ انگریزوں کا قبضہ پوری طرح ہو گیا تھا۔ اور ان کے جاسوس جگہ جگہ خبریں لیتے ہوئے پھر رہے تھے۔ کسی جاسوس نے دہلی کے حاکم کو خبر کر دی کہ میرزا شاہ رُخ باغی دستیاب نہیں ہوئے۔ مگر ان کی بیٹی فلاں گاؤں میں فلاں نمبردار کے گھر میں موجود ہے۔ انگریز حاکم نے اس گاؤں میں پولیس کو بھیجا۔ میرٹھ پولیس نے آکر گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اور نرگس نظر سے مرزا کے متعلق بہت سوالات کئے۔ مگر جب کوئی مفید مطلب جواب نہ ملا تو حکم دیا کہ نمبردار اور اس کا بیٹا باغی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں نے ایک باغی کی بیٹی کو پناہ دی۔ اس لئے ان دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور یہ عورت دہلی میں کسی مسلمان کے حوالے کر دی۔ چنانچہ نمبردار اور اس کا بیٹا قتل کر دیئے گئے۔

داتا کے نام پر۔

دے دو ایک پیسہ ،!

آواز میں کچھ اس بلا کا درد اور سوز تھا کہ مسافر اپنے آپ کو روک نہ سکا، وہ اس آواز کی طرف بڑھا، اس نے دیکھا، ایک کونہ میں دبکی ہوئی ایک بھکارن کھڑی ہے۔ اور بار بار یہ صدا لگا رہی ہے، مسافر کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا، پھر نہ جانے سوچ کر آگے بڑھا، اور دو روپے اس نے بھکارن کے ہاتھ پر رکھ دیئے، جس شہر میں دن بھر بھیک مانگنے کے بعد اسے دو آنے بھی مشکل سے ملتے تھے، وہاں تک ہی شخص نے اسے دو روپے دے دیئے، تو اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس نے کہا،

"بابا خدا بھلا کرے، تم نے ایک بھکارن کو کئی دن کی چھٹی دے دی!"

مسافر نے پوچھا۔

۔ "چھٹی سے کیا مطلب؟"

وہ کہنے لگی۔

میرا پندرہ دن کا سامان ہوگیا۔ اب پندرہ دن تک بھیک نہیں مانگونگی!"

مسافر نے غور سے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا، تم بھکارن نہیں ہو۔۔۔۔۔۔ پھر کون ہو؟"

وہ حسرت بھری آواز میں کہنے لگی۔

"کیا ایک بھکارن کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہے! بھکارن ہوں، اور کون ہوں؟"

مسافر نے انکار میں گردن ہلائی، اور بولا۔

"چھپانے سے کیا فائدہ آواز، یہ زبان، یہ لب ولہجہ، یہ طرزِ گفتگو، یہ استغنا

کشور آرا، اور دوسری شہزادیوں نے جب یہ دیکھا کہ اب جان یا آبرو میں سے ایک ہی چیز سلامت رہ سکتی ہے، تو جان پر آبرو کو ترجیح دی، سامنے ایک باؤلی تھی، سب سے پہلے کشور نے چھلانگ لگائی، پھر فرخ سلطان نے۔ پھر دوسری شہزادیوں نے۔

مرزا قویاش عین اس وقت جب قلعہ سے لوگ بھاگ رہے تھے، ایک گھوڑے پر سوار ہو کر خوش خوش باہر نکلے کہ جا کر انگریزوں کو اپنے کردار کی پاکی کا یقین دلائیں لیکن راستہ ہی میں کسی انگریز کی گولی کا نشانہ بنے اور ٹھنڈے ہو گئے۔

لیکن اب وہ غم انگیز دور ختم ہو گیا ہے، ہندو تو پہلے ہی سے آباد تھے، جو نکالے گئے تھے، وہ جرمانہ دے کر آ گئے تھے، لیکن اب مسلمانوں کو بھی آنے کی اجازت مل گئی تھی، حالات معمول پر آتے جا رہے تھے، دلوں میں زخم تھے، لیکن کاروبار ی تھا۔

ایک روز ـــــــــ

مغرب کا وقت ہو چکا ہے، چڑیاں درختوں پر بسیرا لینے نہ جانے کہاں کہاں کا گشت کرتے واپس آ چکی ہیں، لوگ کاموں سے ہٹ کر اپنے اپنے گھروں کا رُخ کر رہے ہیں، جامع مسجد سے نماز پڑھ پڑھ کر نمازی اُترنے لگے ہیں۔

انہی لوگوں میں ایک بلند و بالا وجیہہ و شکیل انسان بھی ہے، بڑا سا پگڑ سر پر باندھے ہے جس سے چہرہ صاف نظر نہیں آتا، البتہ لباس اور وضع قطع سے کوئی مسافر معلوم ہوتا ہے، جامع مسجد کے زینے سے اُترنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک درد بھری آواز آئی،

اللہ کے نام پر،

مولا کے نام پر،

سامنے پہنچی جھک کر تین مجرے بجالائی حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے، کلثوم لو اب تمہیں خدا کو سونپا، قسمت ہے تو پھر دیکھ لیں گے تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دستِ مبارک دعا کے لئے اٹھائے جو رعشہ سے کانپ رہے تھے اور دیر تک بلند آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔

خداوندا یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں، دُنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں رہا تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور ان بیکس عورتوں کی آبرو بچائیو۔ پروردگار نہیں بلکہ ہندوستان کے سب ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آج کل سب پر مصیبت چھائی ہوئی ہے میرے اعمال کی شامت سے ان کو رسوا نہ کر اور سب کو پریشانیوں سے نجات دے۔

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا زینب کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو ہمراہ کر دیا جو حضور کی ایک بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعے سے نکلا جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں، مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاء الدین، اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے عورتوں میں ایک میں دوسری نواب نور محل تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں جس وقت ہم لوگ رتھ پر سوار ہونے لگے صبح صادق کا وقت تھا تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا ہم نے اپنے بھرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈنے لگے، نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے

ایک بھکارن یہ نہیں ہو سکتا، تم بھکارن نہیں شہزادی ہو۔

یہ سُن کر بھکارن کا چہرہ زرد پڑ گیا، جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مسافر نے کہا۔

"لیکن تمہیں اپنا حال بتانا پڑے گا"

وہ بولی۔

"جس زخم پر کھرنڈ جم چکا، اسے کیوں ناخن سے چھیڑتے ہو، کیا اس لئے کہ وہ ناسور بن جائے؟ میں کچھ بھی تھی، اب تو ایک بھکارن ہوں"۔

مسافر نے جواب دیا۔

اُن باتوں سے کام نہیں چلے گا، اپنی داستانِ غم سناؤ، میں بھی ایک مصیبت ہوں، میرا دل بھی ٹوٹا ہوا ہے، اس دُنیا میں میرا بھی کوئی نہیں ہے، اس طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو گا، غم کا آزار کم ہو گا۔

وہ بولی۔

جس وقت میرے باباجان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج وتخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دِلّی کے لال قلعے میں ایک کہرام مچا ہوا تھا، در و دیوار پر حسرت برستی تھی، اُجلے اُجلے سنگِ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے، تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا، زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کی بچی تھی اور دُودھ کے لئے بلکتی تھی فکر و پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا، نہ کسی انّا کے، ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظلِّ سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا آدھی رات کا وقت سناٹے کا عالم لوگوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے، لیکن حکم سلطانی ملتے ہی ہم حاضری کے لئے روانہ ہو گئے، حضور مصلّے پر تشریف رکھتے تھے، تسبیح ہاتھ میں تھی جب میں

کے اشارے پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے مگر شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اُس نے زبانی بہن کہے کو آخیر تک نباہا اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا، لاچار اجارہ سے روانہ ہو کر حیدر آباد کا رُخ کیا عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی انھوں نے جو سُنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اُتارا، ابھی ہم ندی کے پار اُترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جایئے ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے، سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے، ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اُٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکل کر بھاگے پر ہائے کیسی مصیبت تھی ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے سر کی چادریں وہیں رہ گئیں برہنہ سر حواس باختہ ہزار وقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب محل کے پاؤں خونم خون ہو گئے پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں زینب پر غشی کا عالم تھا مرد ہم کو سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا مُنہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں کہیں سہارا نظر نہیں آتا قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہو گئی لیکن فقیروں کو تو چین اور اطمینان ہوتا ہے، یہاں وہ بھی نصیب نہیں فوج لڑتی ہوئی دور

ہوئے تھے اور پلکیں اُن کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے کا جھلملانا
نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے
رتھ بان کے مکان پر قیام کیا، باجرے کی روٹی اور چھاچھ میسر آئی اس وقت بھوک میں یہ
یہ چیزیں بریانی اور متنجن سے زیادہ مزیدار معلوم ہوئیں، ایک دن تو امن سے بسر ہوئی مگر دوسرے
روز گرد و نواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو لوٹنے چڑھ آئے سینکڑوں عورتیں
بھی اُن کے ساتھ تھیں جو چڑیلوں کی طرح ہم لوگوں کو چمٹ گئیں تمام زیور اور کپڑے
اُن لوگوں نے اُتار لئے جس وقت یہ سڑی بسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے میلے ہاتھوں
سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو اُن کے لہنگوں سے ایسی بُو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا،

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو
کافی ہو سکتا، حیران تھے کہ دیکھئے اب اور کیا پیش آئے گا، زینب پیاس کے مارے رو
رہی تھی سامنے سے ایک زمیندار نکلا میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی بھائی تھوڑا
پانی اس بچی کو لادے، زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری
بہن اور میں تیرا بھائی۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا اُس کا نام بستی تھا،
اُس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں،
ہم نے کہا اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے
خاندان کے خاص مراسم ہیں وہاں لے چل بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا مگر میر فیض علی نے ایسی
بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہیں تم کو ٹھہرا
کر اپنا گھر بار تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا، ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہو گی،
اس پر بے سر و سامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی، وہ لوگ جو ہماری آنکھوں

ایک جڑاؤ انگوٹھی جو لوٹ کھسوٹ سے بچ گئی تھی فروخت کی اُسی میں راستے کا خرچ چلا اور چند روز یہاں بھی بسر ہوئے آخر تابہ کے جو کچھ تھا ختم ہوگیا اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے میرے شوہر اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے اُنہوں نے درود شریف خطِ ریحان میں لکھا اور چار دینار پر ہدیہ کرنے گئے لوگ اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرت میں رہتے تھے۔ باوّل روز پانچ دینار وصول ہوئے۔ اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے کتنی بڑھتی فوراً بک جاتا، اس طرح ہماری گذر اوقات بہت مجمد گی سے ہونے لگی۔

لیکن ابھی مصیبت کا دور ختم نہیں ہوا تھا چند دن کے بعد میرے شوہر مرزا ضیاءالدین ایک حادثہ کا شکار ہو کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئے، حیدر آباد ہمیں کاٹنے کو دوڑنے لگا، نہ روزگار کی کوئی سبیل تھی، نہ گھر میں کچھ اثاثہ تھا کہ اس سے گزران کرتے ایک دن یہ خبر سُننے میں آئی کہ انگریزوں نے شاہی خاندان کی پنشن مقرر کر دی ہے جوں توں کر کے نہ جانے کس طرح گرتی پڑتی دِلّی پہنچی، یہ وہی دِلّی ہے جو کبھی ہماری تھی، یہ وہی سڑکیں ہیں، جن پر دھوم دھام سے ہماری سواریاں نکلتی تھیں، آج میں بھکارن بنی اپنے دادا شاہجہان کی بنائی ہوئی اس مسجد کی سیڑھیوں پر، اور اس لال قلعہ کے عین سامنے جو کبھی ہمارا نشیمن اور مسکن تھا، بھیک مانگ رہی ہوں۔

اللہ کے نام پر،
مولا کے نام پر،
داتا کے نام پر،
د دے دو ایک پیسہ!

رات ہو چلی تھی، وہ یہ آواز لگاتی تاریکی کے پردہ میں گم ہو گئی۔

ہوئی دُور نکل گئی تھی بستی ندی سے پانی لایا ہم نے پیا اور نواب نور محل کے مُنہ پر چھڑکا نور محل ہوش میں آتے ہی رونے لگیں۔

آخر میرے شوہر مرزا ضیاالدین نے سمجھا بجھا کر تسلّی کی باتیں کر کے انہیں مطمئن کیا اتنے میں بستی ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا، اور ہم سوار ہو کر روانہ ہوئے تھوڑی دُور جا کر شام ہو گئی اور ہماری گاڑی ایک گاؤں جا کر ٹھہری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی۔

گاؤں کے نمبردار نے ایک چھپّر ہمارے واسطے خالی کرا دیا جس میں سوکھی گھاس اور پھونس کا بچھونا تھا وہ لوگ اسی گھاس پر جس کو پیال یا پرال کہتے تھے سوتے ہیں ہم کو بھی بڑی خاطرداری سے یہ نرم بچھونا دیا گیا۔

میرا تو اس کوڑے سے جی اُلجھنے لگا پر کیا کرتے اُس وقت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا ناچار اسی میں پورے دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میسّر آئی تھی نیند آگئی، آدھی رات کو ایکا ایکی ہم سب کی آنکھ کھل گئی، گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے اور پسّو جگہ جگہ کاٹ رہے تھے اس وقت کی بے کلی بھی خدا کی پناہ پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی مخملی تکیوں ریشمی نرم نرم بچھونوں کی عادت تھی اس لئے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے آدمی بھی تھے جو بے فکر و غش اسی گھاس پر پڑے سوتے تھے اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرا دل سہما جاتا تھا، کہ قسمت پلٹتے دیر نہیں لگتی کون کہہ سکتا تھا کہ شہنشاہ ہند کے بیوی بچے یوں خاک پر بسیرے لیتے پھریں گے۔

قصّہ مختصر اسی طرح منزل بہ منزل تقدیر کی گردشوں کا تماشا دیکھتے ہوئے حیدر آباد پہنچے اور وہاں ایک مکان کرایہ کا لے کر ٹھہرے جبل پور میں میرے شوہر نے

اے فلک رشک سے نہ جل مرنا!

یہ مکان دلاور علی خاں کا تھا، یہ دروازہ کھولنے والا ہمت علی تھا، اور یہ دستک دینے والا مسافر ——— بخت خاں، !

ہمت علی اسے پہچان سکا، لیکن بخت خاں کے گرم جوش مضائقہ، اور مانوس آواز نے خود ہی اس کا تعارف کرا دیا، وہ اس سے لپٹ کر رونے لگا، بخت خاں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ——— محبت اور مسرت کے آنسو، ——!

پھر وہ آگے بڑھا، اس کی نگاہیں جمیلہ کو ڈھونڈھنے لگیں، لیکن وہ نظر نہ آئی، اس نے دلیر علی کو دیکھنا چاہا، لیکن وہ بھی نہیں تھا، اس نے دلاور علی کو ڈھونڈا مگر وہ بھی نہ اس کی نگاہوں نے قدسیہ بیگم کی تلاش کی، لیکن ان کا بھی کہیں پتہ نہ تھا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ سب لوگ کیا ہوا، کہاں گئے؟ وہ جب یہاں سے رخصت ہوا تھا تو رونق تھی، آبادی تھی، زندگی تھی، اور اب واپس آیا ہے، تو سکون، سکوت اور سناٹے کے سوا کچھ نہیں، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، لیکن نہ کوئی تھا۔ نہ کسی مکین کا نشان نظر آتا تھا، اس نے اپنے دلِ مجبور پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

" سب لوگ کہاں ہیں؟

مسافر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، رومال سے آنسو پونچھتا، وہ ایک گھر کی طرف بڑھا اس نے دستک دی، ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔

آؤ —،

ہمّت علی۔ وہ بھی قبر میں سُکھ، چین اور آرام کی نیند سو رہی ہیں،!

بخت خاں۔ (بچوں کی طرح روتے ہوئے) یہ کیا کہہ رہے ہو ہمّت ؟ چچی جان کا انتقال ہوگیا ؟ وہ مجھ بدبخت سے روٹھ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں،

ہمّت علی۔ یہ نہ سمجھئے بھائی جان، وہ آپ کو بہت چاہتی تھیں، ہم سب سے زیادہ وہ آپ سے کتنی محبّت کرتی تھیں، اس کا اندازہ آپ کے جانے کے بعد ہؤا۔

بخت خاں۔ کتنا خوش خوش آیا تھا میں، لیکن آتے ہی دل کے ٹکڑے ہوگئے، کاش میں مرگیا ہوتا لیکن مجھے تو یہ زخم سہنا تھے، یہ غم جھیلنا تھا، ہائے — دلیر بھی نظر نہیں آتا، وہ کہاں ہے ؟

ہمّت علی۔ شہید ہوگیا۔

بخت خاں۔ (سراسیمہ ہوکر) میرا دماغ پھٹ جائے گا میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی میں دیوانہ ہوجاؤں گا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، دلیر شہید ہوگیا ؟

ہمّت علی۔ جی، — بڑی بہادری سے کئی کو مار کر۔

بخت خاں۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہؤا ؟ خدا کے لئے ہمّت میرے دل کو تسلّی دو!

ہمّت علی۔ بہت مختصر سی کہانی ہے — آپ کے جاتے ہی ابّا جان نے اپنی غلطی محسوس کر لی، خوب روئے، پھر ملازمت سے استعفا بھیج دیا۔

بخت خاں۔ استعفا بھیج دیا ؟ یعنی انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ؟

ہمّت علی۔ جی — انہوں نے فرمایا، میں نمک حرامی نہیں کر سکتا، لہٰذا انگریزوں سے نہیں لڑوں گا، میں غداری نہیں کر سکتا، لہٰذا اپنی قوم کے خلاف انگریزوں کا ساتھ نہیں دونگا، ریزیڈنٹ بہادر نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنے فیصلے پر اڑے رہے، پھر جو آکر گھر بیٹھے ہیں تو مر کر نکلے، غدر سے صرف ایک دن پہلے ان کا انتقال ہؤا۔

ہمت علی کی آنکھیں پھر ڈبڈبا آئیں، بخت کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہمت تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ بتاؤ سب لوگ کہاں ہیں؟ جمیلہ کو میرے آنے کی اطلاع کرو، قدسیہ چچی کو میرا آداب کہو۔ چچا جان تو اس وقت تک دفتر سے واپس آجایا کرتے تھے، آج کہاں رہ گئے؟ ابھی تک کیوں نہیں ——— آئے؟"

ہمت علی جواب دینے کی ہمت اب بھی اپنے اندر نہ پیدا نہ کر سکا، پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، بخت خاں یہ آنسو دیکھ کر بیتاب ہوگیا، اس نے اب تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے جواب دو ہمت کم از کم یہ تو بتادو، جمیلہ تو اچھی ہے، اور سب تو خیریت سے ہیں؟ تمہاری خاموشی میرے دل کے ٹکڑے کئے دے رہی ہے۔ مجھے رونا آرہا ہے، کچھ تو بتاؤ، کچھ تو کہو"

ہمت علی نے بھرآئی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"آپ کسے پوچھتے ہیں بھائی جان؟"

بخت خاں۔ چچا جان کو، وہ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں! بخیریت ہیں؟

ہمت علی۔ نہیں، ان کا انتقال ہوگیا۔

بخت خاں (روتے ہوئے) ان کا انتقال ہوگیا! آہ کیا سن رہا ہوں! میرے پیارے چچا جان، میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی انہیں فراموش نہیں کیا۔

ہمت علی۔ اور ان کی زبان پر بھی مرتے وقت یا آپ کا نام تھا یا کلمہ۔

بخت خاں۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اچھا ذرا چچی جان کے پاس تو مجھے لے چلو، آہ ان کا کیا عالم ہوگا؟ کتنا چاہتی تھیں وہ چچا کو، اس غم نے انہیں کہیں کا نہ رکھا ہوگا، انہیں بلانے کی ضرورت نہیں، میں خود ان کے پاس چلتا ہوں۔

ہمت علی۔ وہ میدانِ جنگ تک نہیں گیا، میدانِ جنگ خود اس کے پاس آگیا۔ ابا اور اماں کے انتقال کے بعد، تراب علی نے پھر ہمارے گھر کے چکر کاٹنا شروع کئے، لیکن وہ سب کے دل سے اُتر چکے تھے، کسی نے مُنہ نہ لگایا، غدر کے بعد جب انگریزوں کی حکومت پھر قائم ہوگئی، اور شہریوں کی پکڑا پکڑی، لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا، تو ایک روز وہ تشریف لے آئے، جمیلہ آپا سے کہنے لگے مُنتی ہو بی جمیلہ، بادشاہ سلامت رنگون چلتے کر دیئے گئے، اور ان کے کمانڈر انچیف مرزا مغل کا کٹا ہوا سر خونی دروازے پر لٹکا دیا گیا، اور رلار ڈگورنر بخت بہادر خاں ایسے دُم دبا کر بھاگے کہ اب دنیا کو اپنا منہ نہ دکھا سکیں گے تم ٹھہریں جوان جہان عورت یونہی گھر بیٹھ کر عمر نہ کاٹ سکو گی، جب شادی کرنی ہی ہے تو اپنے منگیتر تراب خاں کو اس کا حق کیوں نہ دو؟ اس کے دل میں آج بھی تمہاری اُتنی ہی اور ویسی ہی جگہ ہے جیسی آج سے پہلے تھی جمیلہ آپا یہ سُنکر رونے لگی۔ انہوں نے میری اور دلیر کی طرف اشارہ کر کے کہا، جس بہن کے دونوں جوان اور سنڈے مشٹنڈے بھائی خدا رکھے، تندرست اور توانا موجود ہوں، ان کے سامنے، ان کے گھر میں ان کی بہن کی یوں توہین کی جائے، اور وہ چُپ چاپ بیٹھے رہیں؟ حیف ہے تم پر اور تمہاری جوانمردی پر کاش تم عورت ہوتے! یہ سن کر دلیر بجلی کی سی تیزی سے اُٹھا، اور اس نے تڑا تڑ کئی طمانچے تراب علی کے منہ پر لگائے۔

بخت خاں۔ سزا یہی تھی اس کمبخت کی،

ہمت علی۔ وہ تو شاید مار ہی ڈالتا، بڑی مشکل سے میں نے چھڑا دیا، وہ دھول جھاڑتا ہوا اُٹھا اور جاتے جاتے بولا سمجھ لوں گا،!

بخت خاں۔ میں یہیں تھا۔ لیکن ان کے جنازے میں بھی نہ شریک ہو سکا۔
ہمّت علی۔ آپ نے تو پھر ہماری خبر بھی نہ لی۔
بخت خاں۔ چچا کے ڈر سے آنے کی ہمّت نہ پڑی، ورنہ ہر روز جی چاہتا تھا کہ آؤں،
ہمّت علی۔ وہ بھی ہر روز آپ کی راہ تکتے تھے، ہم لوگ جب پوچھتے تھے بلا لائیں، تو
بگڑ جاتے تھے، ہرگز نہیں، اسے آنا ہے تو خود آئے گا، اور پھر رونے لگتے حکیم
کہتے تھے کوئی صدمہ ہے جو گھن کی طرح انہیں چاٹ رہا ہے، وہ صدمہ
صرف آپ کا تھا۔
بخت خاں۔ میں بیہوش ہوا جاتا ہوں ہمّت، مجھے پانی پلاؤ!
ہمت نے ایک گلاس پانی کا لا کر دیا، بخت نے اسے پیا، پھر ایک ٹھنڈا
سانس بھر کر ہمّت کی طرف دیکھنے لگا کہ اب وہ کیا کہتا ہے؟
ہمّت علی۔ اماں دو دو غم نہ سہہ سکیں، آپ کی جدائی اور ابا جان کی وفات جب
تک ایک غم تھا، استقلال کے ساتھ جھیل رہی تھیں، لیکن جب دو غموں
کا بوجھ پڑا، تو ہمّت ہار گئیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، جیسے کل کا واقعہ ہو، بظاہر
اچھی بھلی چارپائی پر بیٹھی تھیں، ایک بیک سینہ پر ہاتھ رکھا، اور ایک آہ کے
ساتھ گر پڑیں، ہم سب نے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا، میں دوڑا دوڑا حکیم صاحب
کے پاس گیا۔ انہوں نے آکر نبض دیکھی، اور کہا، اب اُن میں کیا رکھا ہے،
یہ اللہ کو پیاری ہو چکیں۔
بخت خاں۔ اتنا بڑا غم جھیلنا واقعی ان کے بس سے باہر تھا، میں جانتا ہوں،
وہ چچا سے کیسی محبّت کرتی تھیں، ـــــ لیکن تم نے دلیر کا ماجرا نہیں،
اس نے تو ابھی تلوار پکڑنا بھی نہیں سیکھا تھا، اسے کیا ضرورت تھی،
میدانِ جنگ میں کودنے کی؟

ہیں، نہ زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لیتی ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں، چہرے پر مُردنی چھائی رہتی ہے، سُوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں ——

بخت خاں۔ (کھڑا ہو کر بیتابی کے ساتھ) ارے بھئی یہ باتیں چھوڑو، مجھے جمیلہ کے پاس لے چلو، میں اب تمہارے منہ سے ایک بات بھی سُننا نہیں چاہتا جو کچھ سنوں گا اُس سے سنوں گا، بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کدھر ہے!

ہمت علی۔ اپنے کمرہ میں!

بخت خاں تیر کی طرح اپنے کمرے میں پہنچا، جمیلہ سوگوار حالت میں ایک چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی، اس کا اب بہترین مشغلہ یہی تھا، کہ قرآن پڑھتی اور ماں باپ کو ثواب بخشتی، روتی، گڑگڑاتی، اور اپنے خدا سے بخت خاں کی صحت و سلامتی کی دُعا مانگتی، اس وقت بھی وہ قرآن پڑھ کر اسے جزدان میں لپیٹ کر دونوں ہاتھ اُٹھائے اپنے پاک پروردگار سے دعا مانگ رہی تھی، بخت خاں پہنچا، تو وہ اسے دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس کے مُنہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

"آپ —— آپ؟"

بخت خاں نے محبّت کی بیتابی سے جواب دیا۔

"ہاں جمیلہ میں آ گیا، میں تمہارے پاس آ گیا، تمہیں لینے"

شاید وہ اس سے آگے بھی کچھ کہتا، لیکن جمیلہ بیہوش ہو چکی تھی، بخت خاں نے ہمّت کو آواز دی، وہ دوڑا دوڑا آیا، جلدی سے شربت انار عرق بیدمشک حلق میں ٹپکایا گیا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بہت کمزور اور نحیف آواز میں کہا،

"آپ، کیسے آ گئے؟ آپ کے تو دشمن لگے ہوئے ہیں، حکومت نے ایک

بخت خاں۔ وہ بکتا ہے، وہ کیا سمجھے گا؟ ہم سمجھ لیں گے اس سے،!

ہمت علی۔ دوسرے دن میں کسی کام سے شہر گیا تھا، واپس آیا تو دیکھتا کیا ہوں گھر میں میدانِ جنگ کا نقشہ قائم ہے، تراب علی نے مخبری کر دی کہ دلیر نے کئی انگریز مردوں، عورتوں، اور بچوں کو غدر کے دوران میں جان سے مارا ہے سچائی کا ثبوت یوں دیا کہ، اگر میں دشمن ہوتا تو دوسرے بھائی کا یعنی میرا نام بھی لیتا، لہٰذا اس کی خبر دے رہا ہوں جو واقعی قاتل ہے، بس پھر کیا تھا کئی سپاہی بے کروہ چڑھ آیا ہمارے گھر میں، اور دلیر سے کیا، چلو، پھانسی پاؤ اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے ابا، اماں کے پاس چلے جاؤ، واقعی آپ نے سچ کہا، وہ تلوار چلانہیں جانتا، لیکن نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی، کوٹھڑی میں گیا، اور ابا جان کی تلوار نکال لایا، اور آتے ہی اس تیزی سے اس نے وار کیا کہ دو سپاہی تو فوراً گر پڑے اور ایڑیاں رگڑنے لگے۔ پھر سب نے مل کر حملہ کیا، دلیر نے پھر ایک سپاہی کے پیٹ میں تلوار بھونک دی، لیکن کب تک اور کس کس سے لڑتا، آخر وہ جان ہار، زخموں کی تاب نہ لاکر شہید ہو گیا، میں اس وقت پہنچا، جب لاشیں اُٹھ چکی تھیں، البتہ خون سے گھر کا صحن لالہ زار ہو رہا تھا، میں نے بھی تلوار اُٹھائی، اور چاہا کہ جاکر تراب علی کی گردن اُتاروں، لیکن جمیلہ باجی کمر سے لپٹ گئیں، پھر میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی۔ ——

بخت خاں۔ کیا جمیلا زندہ ہے؟

ہمت علی۔ جی ہاں زندہ ہیں —— لیکن مُردوں سے بدتر، جس دن سے آپ گئے ہیں، اُنہوں نے دُنیا کی ہر لذت اپنے اُوپر حرام کر لی ہے نہ اچھا کھانا کھاتی ہیں، نہ اچھے کپڑے پہنتی ہیں، نہ ہنستی ہیں، نہ مسکراتی ہیں نہ بولتی

ہمارا حصّہ ہے، اور یہیں برابر تلوار کے زور سے ملتا رہتا ہے —— ہمّت اُٹھو! جمیلہ کو تیار کرو، میں اپنے آدمیوں کو ہدایت دے کر ابھی آتا ہوں!"

تھوڑی دیر کے بعد بخت خاں واپس آیا، اس کے چہرے پر تبسّم کھیل رہا تھا اس نے کہا۔

"آؤ چلیں —— میں نے تراب علی خاں بہادر کا بھی بندوبست کر لیا ہے، وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے!"

جمیلہ اور ہمت علی بخت خاں کے پیچھے پیچھے باہر آئے، یہاں ایک رتھ کھڑی تھی اس پر تینوں آدمی بیٹھ گئے، شہر سے باہر نکل کر جب جمنا کے کنارے پہنچے، تو بہت سے سوار نظر آئے، بخت خاں نے تالی بجائی، انہوں نے اللہ اکبر کے نعرہ سے جواب دیا، بخت خاں نے کہا۔

"دیکھو جمیلہ، یہ ہمارے بہادروں اور غازیوں کی فوج کا ایک حصّہ ہے جنہوں نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ اب تک ہار نہیں مانی۔ اور زندگی بھر کبھی ہار نہیں مانیں گے!"

اتنے میں دو سفید گھوڑے، ساز و یراق سے آراستہ سامنے لا کر کھڑے کر دیئے گئے، سب سے پہلے بخت ایک پر بیٹھا، جمیلہ کو بھی اس نے اسی گھوڑے پر بٹھا لیا، دوسرے پر ہمّت علی بیٹھا، بخت نے اپنے ایک سپاہی سے کہا۔

"اور وہ ہمارا مجرم؟"

اتنے میں، سپاہی کشاں کشاں تراب علی کو سامنے لائے، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، وہ اپنے گھر سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا، بخت خاں نے اس سے کہا،

"تم نے دیکھا، بخت خاں کا خدا انگریزوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے!"

لاکھ روپیہ کا اعلان کیا ہے آپ کے سر کا، خدا کے لئے جائیے چلے جائیے!"

"بخت خاں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، یہ سب کچھ میں جانتا ہوں، لیکن حکومت میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی، میرے آدمی سادہ لباس میں ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں، کوئی حادثہ پیش آئے تو ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

وہ کہنے لگی "لیکن آپ کیوں آئے اس خطرہ کی حالت میں؟"

اس نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا

اپنی جمیلہ کو لینے، ـــــ جمیلہ چلو، میرے ساتھ چلو، انگریزوں نے دِلّی فتح کر لی، لیکن بخت خاں کو نہ جیت سکے، انہوں نے دِلّی پر قبضہ کر لیا، لیکن بخت خاں پر قبضہ نہ کر سکے، بخت خان آج بھی آزاد ہے، اس کے دلیر اور رولا در سپاہی آج بھی انگریزوں کی سرکوبی جب اور جہاں موقع ملتا ہے، کرتے رہتے ہیں، آؤ، رات کے اس سناٹے میں ہم نکل چلیں، میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی آزار پہنچے، اسی لئے میں نے یہ وقت متعین کیا ہے، لیکن اگر مزاحمت ہوئی، تو ہم سمجھ لیں گے، بھگت لیں گے۔

جمیلہ۔ لیکن کہاں۔

بخت خاں۔ وہاں جہاں تمہارے بخت خاں کی حکومت ہے، جہاں کوئی انگریز قدم نہیں رکھ سکتا، جہاں سب لوگ آزاد ہیں، ہم جنگل میں رہتے ہیں، اُونچے اُونچے پہاڑ ہمارے مسکن ہیں، انگریز سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتے ہیں، ہم انگریزوں سے باج لیتے ہیں، ان کے خزانے میں
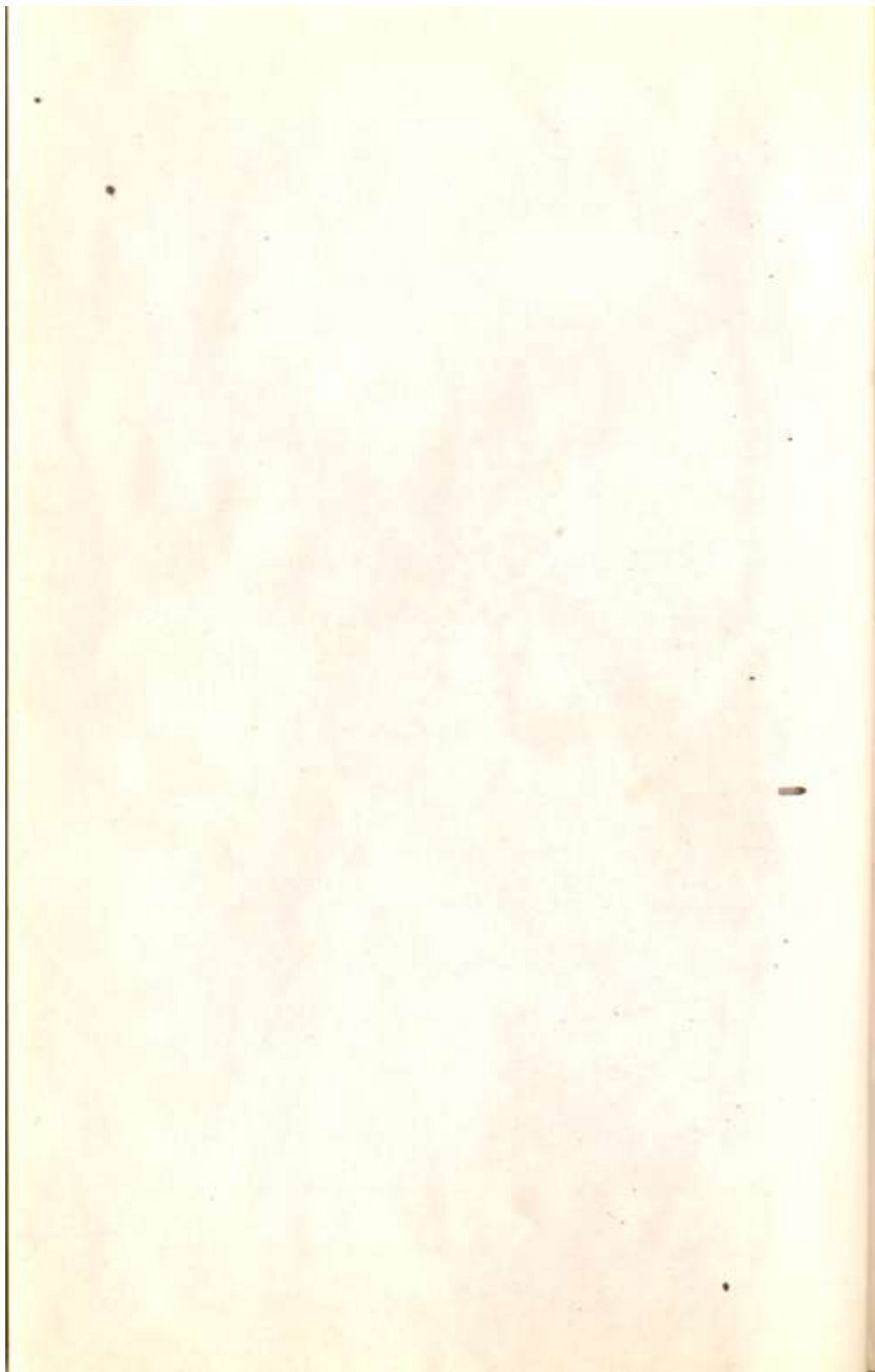
پھر اس نے کہا:۔

" تم لرز کیوں رہے ہو؟ بخت خاں ُبزدلوں کی جان نہیں لیتا،!"

پھر اس نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا۔

" اس غدّار کی ناک کان کاٹ لو، اس کی جان لو!"

تراب علی نے لاکھ لاکھ ہاتھ پاؤں جوڑے، سر ٹپکا، منتیں کیں، لیکن نہ اپنی ناک سلامت رکھ سکا نہ کان،!

اور اس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد بخت خاں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نہ جانے کہاں اپنے سواروں کے ساتھ روانہ ہو گیا[1]، آج اتنے دنوں بعد جمیلہ کے ہونٹ بھی تبسّم سے آشنا ہوئے، وہ مسکرا رہی تھی!

---
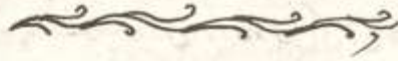
[1] تمام مؤرخ اس پر متفق ہیں کہ بخت خاں کو انگریز نہ گرفتار کر سکے۔

کتابت کنندہ محمد رفیع خوش نویس ۲۲ دسمبر ۱۹۷۹ء